شعیب خالق کے فکشن میں جدید معاشرے کے فرد کے داخلی اور خارجی مسائل

مقالہ برائے ایم۔فل (اردو)

مقالہ نگار:

محمد شعیب خان

فیکلٹی آف لینگویجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

دسمبر، ۲۰۲۰

شعیب خالق کے فکشن میں جدید معاشرے کے فرد کے داخلی اور خارجی مسائل

یہ مقالہ

ایم۔ فل (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا۔

فیکلٹی آف لینگویجز

(اردو زبان وادب)

مقالہ نگار:

محمد شعیب خان

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

دسمبر، ۲۰۲۰

مقالے کا دفاع اور منظوری کا فارم

زیرِ دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انھوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگویجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: شعیب خالق کے فکشن میں جدید معاشرے کے فرد کے داخلی اور خارجی مسائل

پیش کار: محمد شعیب خان رجسٹریشن نمبر: 1462/M/U/S18

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: اردو زبان و ادب

ڈاکٹر صائمہ نذیر ____________________

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر شاہد صدیقی ____________________

ڈین فیکلٹی آف لینگویجز

پروفیسر ڈاکٹر محمد سفیر اعوان ____________________

پرو ریکٹر اکیڈمکس

تاریخ ________

اقرارنامہ

میں، محمد شعیب خان حلفیہ بیان کرتا ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو یجز اسلام آباد کے ایم۔فل سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر صائمہ نذیر کی نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا ہے اور نہ آئندہ کروں گا۔

محمد شعیب خان

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

فہرست ابواب

عنوان	صفحہ نمبر
مقالہ کے دفاع کی منظوری کا فارم	iii
اقرار نامہ	iv
فہرست ابواب	v
Absrtact	viii
اظہار تشکر	ix
باب اول: سوانح، اصولی مباحث اور روایت	۱
الف: تمہید	۱
i. موضوع کا تعارف	۱
ii. بیان مسئلہ	۲
iii. مقاصد تحقیق	۲
iv. تحقیقی سوالات	۲
v. نظری دائرہ کار	۲
vi. تحقیقی طریقہ کار	۳
vii. مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق	۳
viii. تحدید	۳
ix. پس منظری مطالعہ	۳

x. تحقیق کی اہمیت ۴
(ب) شعیب خالق سوانح اور شخصیت ۴
۱۔پیدائش ۴
۲۔خاندان ۵
۳۔تعلیم ۵
۴۔ملازمت ۷
۵۔ادبی خدمات ۹
(ج) جدید معاشرے اور فرد کے مسائل ۱۲
۱۔فرد اور معاشرے کا تعلق ۱۸
۲۔جدید معاشرے کے فرد کے مسائل ۲۳
(د) اردو فکشن میں فرد کے داخلی اور خارجی مسائل (مختصر جائزہ) ۴۱
حوالہ جات ۵۵
باب دوم: شعیب خالق کے فکشن میں داخلی مسائل ۵۹
۱۔انسان کی حقیقت ۶۲
۲۔کائنات کی حقیقت ۷۲
۳۔خوف ۷۹
۴۔مایوسی وناامیدی ۸۸
۵۔ذہنی کشمکش ۹۱
۶۔تنہائی وغیرہ ۹۷
حوالہ جات ۱۰۵

باب سوم:-شعیب خالق کے فکشن میں خارجی مسائل ۱۰۸

۱۔ انسانی اعضا کی سمگلنگ ۱۱۲

۲۔چائلڈ لیبر ۱۱۴

۳۔غریب طبقے کے مسائل / استحصال ۱۱۷

۴۔ چھوٹے پیشوں سے حقارت کا رویہ ۱۲۱

۵۔ تعلیم سے دوری

۱۲۵

۶۔ جنسی بے راہ روی

۱۳۰

۷۔منشیات کا استعمال

۱۳۴

۸۔خواتین کا استحصال ۱۴۲

۹۔مذہب کی ڈھال اور بے عملی

۱۴۵

۱۰۔رشوت، کرپشن

۱۴۸

حوالہ جات ۱۴۹

باب چہارم:- ۱۵۲

مجموعی جائزہ ۱۵۲

نتائج ۱۵۷

سفارشات ۱۵۹

کتابیات ۱۶۱

Abstract

The individuals are facing internal and external problems in modern society. Due to these issues quite a few evils emerge at social level. Which appear ordinary at surface but on the long run these evils result in moral downfall and social deterioration. Shoaib Khaliq has described this situation in Pakistani society in his fiction with literary context.

Shoaib Khaliq presents thematic diversity in his writings. However, this study is limited to the internal and external problems faced by the individual in modern age in his fiction. The remaining themes have not been considered in this context.

In current study focuses on Shoaib Khaliq's fictional collections,"*Be Harf Lafz, Chhatri Numa Kahanian*" and novel "*Aunti*". To understand the documented and fundamental origins of Shoaib Khaliq's writings his fiction and novel is taken into consideration. To comprehend Shoaib Khaliq's life and personality his different interviews have been included. This study encompasses interviews, periodicals, journals and theses as well as books relevant to his fiction and internal and external issues of individuals. To expand this study the libraries from governmental institutes, universities and from public offices have been approached.

In current age Shoaib Khaliq's name is very prominent regarding fiction in Urdu literature. Like his contemporary novelists he possesses the ability to observe the problems of modern age. He has projected the internal and external problems of individuals through his experiences. Keeping in view his thematic divergence there is a dire need to analyze his writings with a concerned theory. This theses is an attempt in this context.

اظہار تشکر

اس مقالے کی تکمیل میں نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد کے صدر شعبہ اردو ڈاکٹر عابد حسین سیال،ڈاکٹر روبینہ شہناز،ڈاکٹر فوزیہ اسلم،انتہائی واجب الاحترام اساتذہ کرام ڈاکٹر شفیق انجم،ڈاکٹر نعیم مظہر،ڈاکٹر صائمہ نذیر،ڈاکٹر محمود الحسن،ڈاکٹر رخشندہ مراد،ڈاکٹر ارشاد بیگم،ڈاکٹر نازیہ یونس اور خصوصاً اپنی نگران مقالہ ڈاکٹر صائمہ نذیر کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے شفقتوں سے نوازا اور ہر لمحہ میری حوصلہ افزائی کی۔مقالے کے آغاز سے لے کر اختتام تک مجھے جو جو مشکلات پیش آئیں انھوں نے ہمیشہ میری رہنمائی کی۔اس مقالے کی تیاری میں شعبہ اردو کے جن دیگر دوست احباب کلاس فیلوز اور عزیزوں کا تعاون حاصل رہا ان سب کا احسان مند اور شکر گزار ہوں۔ڈاکٹر نجیبہ عارف اور ڈاکٹر عابد حسین سیال کا خصوصی شکریہ اور دعائیں کہ انتہائی مصروفیت کے باوجود مقالے کے سلسلے میں میری رہنمائی کی۔ڈاکٹر شفیق انجم اور ڈاکٹر نعیم مظہر کا شکریہ اور دعائیں جن کی شخصیت سے متاثر ہو کر آگے بڑھنے اور پڑھنے کا جزبہ پیدا ہوا۔اپنے والدین،بھائیوں، بہنوں کا شکریہ اور دعائیں جنھوں نے ہر پل میرا حوصلہ بڑھایا اور جن کی دعائیں ہر پل میرے ساتھ رہیں۔

آخر میں یہ بندہ اپنے رب کا سب سے زیادہ شکر گزار ہے اور اس کے سامنے سجدہ ریز ہے۔کیونکہ دعاؤں کو شرف قبولیت بخشنا اور مسافر کو اس کی منزل سے ہمکنار کرنا صرف اسی کے ہی احاطہ قدرت میں ہے۔

محمد شعیب خان

اسکالر ایم۔ فل اردو

باب اوّل:

سوانح، اصولی مباحث اور روایت

الف۔ تمہید:

i. موضوع کا تعارف:

میرے ایم فل اردو کے مقالہ کا مجوزہ موضوع "شعیب خالق کے فکشن میں جدید معاشرے کے فرد کے داخلی اور خارجی مسائل" ہے۔ معاشرہ کلی حیثیت رکھتا ہے جبکہ فرد معاشرے کا جز ہے افراد کے مجموعہ سے معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔ فرد معاشرے کا اہم جز ہے۔ افراد کی خوشحالی سے معاشرہ خوشحال اور ملک ترقی یافتہ ممالک کی فہرست میں شامل ہوتے ہیں۔

شعیب خالق کا نام اردو فکشن نگار کے حوالے سے اکیسویں صدی کے لکھنے والوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اپنے اسلوب کے اچھوتے پن اور بے ساختگی کے باعث انھوں نے بہت جلد اردو دنیا کی توجہ اپنی طرف مبذول کروائی ہے۔ انھوں نے اپنے فکشن میں جدید معاشرے کے فرد کے داخلی اور خارجی مسائل کو موضوع بنایا ہے۔ جدید معاشرے سے مراد ایسا معاشرہ مراد لیا جاتا ہے جو ۱۹۶۰ء کی دہائی کے بعد کا عرصہ ہے۔ اس دور نے نئی سائنسی ایجادات، ٹیکنالوجی اور نئے نئے انکشافات کی صورت میں جہاں فرد کو فائدہ دیا ہے اس کے ساتھ ساتھ فرد کے مسائل میں بھی اضافہ کیا ہے اور اس کے ماحول کو داخلی اور خارجی سطح پر انتشار کا شکار کیا ہے۔ اس سے فرد کی جذباتی اور فکری سوچ میں تبدیلی آئی ہے اور عدم تحفظ کی نئی صورتحال نے جنم لیا ہے۔ اس طرح اس کے اثرات معاشرے کے ساتھ ساتھ ادب پر بھی پڑے ہیں۔ ادب نے اس سے متاثر ہو کر اپنے موضوعات کو نئی جانب موڑ لیا ہے جس میں انتشار و بحران، تنہائی، بے روزگاری، غربت، مایوسی و بے روزگاری، اجنبیت و بے معنویت شامل ہیں۔

اردو ادب میں شعیب خالق کی پہچان فکشن نگار کے حوالے سے ہے۔ اس حوالے سے ان کا پہلا افسانوی مجموعہ "بے حرف لفظ" ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا۔ اس طرح ۲۰۰۱ء میں ناولٹ "آنٹی" منظر عام پر آیا جبکہ ۲۰۱۹ء میں ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ "چھتری نما کہانیاں" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔

مجوزہ تحقیق ان تینوں کتابوں میں " شعیب خالق کے فکشن میں جدید معاشرے کے فرد کے داخلی اور خارجی

مسائل" کے حوالے سے کی گئی۔ اس میں جائزہ لیا گیا کہ انھوں نے کس طرح جدید معاشرے کے مسائل کو اپنی تحریروں کے اندر اجاگر کیا ہے۔

ii. بیان مسئلہ:

دور جدید کا انسان مختلف نوعیت کے داخلی اور خارجی مسائل کا شکار ہے۔ شعیب خالق کے ہاں جدید معاشرے کا فرد خوف، مایوسی اور کشمکش کا شکار نظر آتا ہے اور اس کائنات کے وجود میں آنے کو تلاش کرتا نظر آتا ہے۔ اس طرح ان کے ہاں جدید معاشرے کا فرد اپنے خارج کے مسائل پر بھی نظر رکھتا ہے اور معاشرتی مسائل میں چائلڈ لیبر، جنسی بے راہ روی اور معاشی استحصال کے خلاف آواز بلند کرتا ہے۔

iii. مقاصد تحقیق:

ا۔ معاشرہ اور فرد کے تعلق کو اور جدید معاشرے کے مسائل کو متعارف کروانا

۲۔ شعیب خالق کے فکشن میں جدید معاشرے کے فرد کے داخلی مسائل کا تجزیہ کرنا

۳۔ شعیب خالق کے فکشن میں جدید معاشرے کے فرد کے خارجی مسائل کو جاننا

iv. تحقیقی سوالات:

ا۔ جدید معاشرہ کیا ہے؟ نیز جدید معاشرے کے مسائل کیا ہیں؟

۲۔ شعیب خالق کے ہاں جدید معاشرے کے فرد کے داخلی مسائل کیا ہیں؟

۳۔ شعیب خالق کے ہاں جدید معاشرے کے فرد کے خارجی مسائل کیا ہیں؟

v. نظری دائرہ کار:

کسی تخلیق کار کی تحریر کئی عناصر سے تشکیل پاتی ہے جس میں بعض عناصر اس صنف ادب کے تقاضے کے تحت آتے ہیں جو تخلیق کار اختیار کرتا ہے اور بعض عناصر اس کی شخصیت اور انفرادیت کے آئینہ دار ہوتے ہیں اس بنا پر اس کی تحریر، اسلوب اور موضوعات دوسرے تخلیق کاروں سے مختلف ہوتے ہیں اور تخلیق کار کی انفرادیت کا نقش بھی اس تحریر میں موجود ہوتا ہے۔ مجوزہ تحقیق اس تناظر میں "شعیب خالق کے فکشن میں جدید معاشرے کے فرد کے داخلی اور خارجی مسائل" کے حوالے سے ہے کہ انھوں نے کس منفرد انداز میں جدید معاشرے کے فرد کے مسائل کو اجاگر کیا ہے اور ان پر توجہ مبذول کرانے میں وہ کس حد تک کامیاب رہے ہیں۔

vi. تحقیقی طریقہ کار:

زیر نظر مقالے میں شعیب خالق کے افسانوی مجموعے "بے حرف لفظ" (۱۹۹۰ء) ناولٹ "آنٹی" (۲۰۰۱ء) اور افسانوی مجموعہ "چھتری نما کہانیاں" (۲۰۱۹ء) پر انحصار کیا گیا اور جائزہ لیا گیا کہ شعیب خالق نے فکشن میں کس طرح سے جدید معاشرے کے فرد کو در پیش جزوی اور کلی مسائل کے تناظر میں دیکھا ہے اور کس طرح سے فکشن کے اندر ان کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ شعیب خالق کی شخصیت ، ان کے فکشن، ان کی ذات اور تحریروں کے حوالے سے رائے جاننے کی کوشش کی گئی اور اس کو حوالہ بنایا گیا۔ اس کے علاوہ معاصر افسانہ نگاروں کی آراء کو بھی شامل کیا گیا۔

vii. مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق:

شعیب خالق کے پہلے افسانوی مجموعے "بے حرف لفظ" اور ناولٹ "آنٹی" کا فنی و فکری جائزہ کے حوالے سے ایم اے کی سطح پر مقالہ نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد سے ۲۰۰۹ء میں ہو چکا ہے۔ تاہم شعیب خالق کے فکشن میں جدید معاشرے کے فرد کے داخلی اور خارجی مسائل کا مطالعہ ابھی تحقیق طلب ہے۔

viii. تحدید:

شعیب خالق کے ہاں موضوعاتی تنوع پایا جاتا ہے لیکن مجوزہ موضوع کو "شعیب خالق کے فکشن میں جدید معاشرے کے فرد کے داخلی اور خارجی مسائل" کے بیان تک محدود رکھا گیا اور اسے موضوع تحقیق بنایا گیا۔

ix. پس منظری مطالعہ:

ادب معاشرے کا اہم حصّہ ہے ادب کی اصناف میں افسانہ وہ صنف ہے جس نے فرد کی زندگی کے تمام پہلوؤں کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ فرد معاشرے کا ایک حصّہ ہے۔ اسی فرد سے معاشرہ تشکیل پاتا ہے اور فرد کے مسائل کی وجہ سے معاشرہ انتشار کا شکار ہوتا ہے۔ اس طرح اردو افسانوں کے اندر فرد کے مسائل کو اجاگر کیا گیا ہے۔ ہر دور کے اندر مصنفین نے قلم اٹھایا ہے۔ پس منظری مطالعہ کے طور پر فرد اور معاشرہ کے مسائل پر لکھی گئی کتب، مضامین کو پیش نظر رکھا گیا ہے اور جائزہ لیا گیا ہے کہ مختلف مصنفین نے اس حوالے سے کس طرح کاوشیں کی ہیں۔ اس کے علاوہ شعیب خالق کے فکشن کے حوالے سے تبصروں، تحریروں کو بھی شامل تحقیق کیا گیا ہے۔ مزید شعیب خالق سے مل کر ان کی ذاتی رائے کو بھی جاننے کی کوشش کی گی کہ انھوں نے کس طرح سے جدید معاشرے کے فرد کے مسائل کو دیکھا ہے۔ اس طرح ۱۹۶۰ء کی دہائی میں ملکی صورتحال کا جائزہ لیا

گیا ہے کہ اس دور میں لوگوں کو کون کون سی آسانیاں میسر آئیں اور کن کن مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ نیز اس دور کی سیاسی صورتحال کا جائزہ لیا گیا اور حکومتی پالیسیوں کا فرد پر مثبت اور منفی اثرات کے حوالے سے بھی جائزہ لیا گیا ہے۔

x. تحقیق کی اہمیت:

فرد معاشرے کا اہم حصہ ہوتا ہے فرد کی خوشحالی سے معاشرہ خوشحال ہوتا ہے۔ فرد کے مسائل سے معاشرتی مسائل میں اضافہ ہوتا ہے۔ شعیب خالق کے فکشن میں ہمیں جدید معاشرے کے فرد کے داخلی اور خارجی مسائل کا مطالعہ ملتا ہے۔ جدید معاشرہ وہ ہے جو ۱۹۶۰ء کی دہائی کے بعد کا عرصہ ہے۔ اس دور میں سائنسی ترقی اور نئے انکشافات نے جہاں بہت سارے فوائد دیے وہاں افراد کے مسائل میں بھی اضافہ کیا ہے۔ اس سے فرد کی جذباتی اور فکری سوچ میں تبدیلی آئی ہے اور انتشار، بحران، مایوسی، بے روزگاری جیسی صورتحال نے جنم لیا ہے۔ اس تحقیق کی بدولت جدید معاشرے کے فرد کو درپیش داخلی اور خارجی مسائل کو سمجھنے میں مدد ملی اور ان مسائل کی بدولت فرد کو درپیش مسائل اور ان کی مشکلات کی طرف توجہ مبذول کی گئی۔

ب۔ شعیب خالق سوانح اور شخصیت

پیدائش:

شعیب خالق ۱۰ اکتوبر ۱۹۵۶ء کو شکر پڑیاں (راولپنڈی) میں پیدا ہوئے۔ جب شعیب خالق پیدا ہوئے تو ان کے والدین نے ان کی تاریخ پیدائش کسی بھی کاغذ میں تحریر نہیں کی تھی جس کی وجہ سے میٹرک کے داخلہ فارم کو پُر کرتے وقت جب ان کو اپنی تاریخ پیدائش لکھنے کی ضرورت پیش آئی تو انھوں نے اپنی تاریخ پیدائش اپنی سوچ کے مطابق لکھ دی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے والدین، ان کے بہن بھائی اور خود ان کو بھی اپنی تاریخ پیدائش یاد نہیں تھی۔ اپنی تاریخ پیدائش کے حوالے سے شعیب خالق کا کہنا ہے:

> "میری تاریخ پیدائش میری اپنی سوچی ہوئی ہے۔ تاریخ پیدائش لکھنے کی ضرورت مجھے اس وقت پیش آئی جب میں میٹرک کا داخلہ فارم پر کر رہا تھا۔ اس وقت یاد رکھنے کے حوالے سے اپنی سوچ کے مطابق دس تاریخ اور دسواں مہینہ لکھ دیا۔ البتہ مجھے سن معلوم تھا اور سن کے حوالے سے میں نے اپنے والدین سے سن رکھا تھا۔"[۱]

شعیب خالق کا بچپن اپنے بہن بھائیوں اور خاندان والوں کے ساتھ گزرا اور اس طرح بچپن کے ان

دنوں کی یادیں ہر وقت ان کے سامنے ہوتی ہیں۔ وہ اکثر اپنے بچپن کی زندگی کو یاد کر کے بہت خوش ہوتے ہیں کیونکہ اس زمانے سے ان کی بہت ساری یادیں جڑی ہوئی ہیں۔

خاندان:

شعیب خالق کے خاندان کا تعلق آزاد کشمیر کے نواحی گاوں "ٹائیں" سے ہے۔ ان کا تعلق ایک فقیر خاندان سے ہے۔ ان کے والد کا نام راجہ عبد الخالق اور معروف نام راجہ کالا خان تھا۔ اس طرح لوگ ان کو زیادہ تر راجہ کالا خان کے نام سے جانتے تھے۔ ان کی والدہ محترمہ "گکھڑ" خاندان سے تعلق رکھتی تھی جو خطہ پوٹھوہار کا نمائندہ خاندان تھا۔ ان کے نانا عنایت اللہ جان کیانی نے انڈین نیشنل آرمی میں کمیشن لیا۔ بعد میں پاکستان آرمی میں خدمات سر انجام دیں اور کرنل کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ اپنے خاندانی پس منظر کے حوالے سے ان کا کہنا ہے:

> "میرا تعلق دو خاندانوں سے ہے۔ ایک میری والدہ کا خاندان جو "گکھڑ" خاندان ہے اور دوسرا میرے والد کا خاندان فقیر خاندان سے جڑا ہے۔ یوں ان دو مختلف خاندانوں کی وجہ سے ورثے میں مجھے انسانی تعلقات، سائیکی کا میل جول اور سادگی جیسی ایسی خوبیاں ملیں جو آگے چل کر میرے لیے ادبی سطح پر معاون ثابت ہوئیں۔"(۲)

شعیب خالق کے سات بہن بھائی ہیں۔ دو بہنیں اور ایک بھائی ان سے بڑے ہیں۔ اس طرح دو چھوٹی بہنیں ہیں اور ایک بھائی ان سے چھوٹا ہے۔

تعلیم:

شعیب خالق نے اسلامیہ گرلز ہائی سکول سے اپنی ابتدائی تعلیم مکمل کی۔ اس طرح اس سکول میں انھوں نے پانچویں جماعت تک تعلیم حاصل کی سکول کے اس دور میں اساتذہ نے ان کی شخصیت پر گہرا اثر مرتب کیا۔ ان کی شفقت کی بدولت وہ سکول کے بہت ہونہار طالب علم رہے۔ اسلامیہ گرلز ہائی سکول میں زیر تعلیم رہنے کے بعد انھوں نے سر سید سکول چکلالہ میں داخلہ لیا اور اپنی پڑھائی کو اس سکول میں جاری رکھا۔ شعیب خالق نے اس دوران خوب دل لگا کر محنت کی اور کامیابی حاصل کی۔ شعیب خالق نے سکول دور میں ہی مختلف سرگرمیوں میں حصّہ لینا شروع کر دیا جس کی بدولت ان کی خداداد صلاحیتیں تو جلد ہی بچپن سے ہی نکھر کر سامنے آنا شروع ہو گئیں۔ سکول دور میں وہ بزم ادب کمیٹی کے اہم رکن تھے اور اس بزم کے ذریعے انھوں نے اساتذہ اور طلباء میں مقبولیت حاصل کی اور ان کی توجہ اپنی جانب مبذول کروانے میں

کامیاب ہوگئے۔اس کے ساتھ ساتھ دیگر ہم نصابی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔خاص کر ان کی مقبولیت کی وجہ ان کا سکول کی کرکٹ ٹیم کا نمایاں کھلاڑی ہونا اور سکول کی مختلف تقریبات میں مزاحیہ کرداروں کی وجہ سے ہے۔ان سب کی وجہ سے وہ سکول دور میں ایک نمایاں کردار کے طور پر سامنے آئے۔اس حوالے سے شعیب خالق کا کہنا ہے:

> "بچپن ہی سے گلی محلے میں اکثر لڑکے کرکٹ کھیلتے تھے۔اس کھیل نے آہستہ آہستہ مجھے بھی راغب کیا۔اس کھیل کود کی وجہ سے سکول کے اندر میں کافی مقبول ہوا اور کرکٹ ٹیم کے اندر نمایاں کھلاڑی کے طور جانا جاتا تھا اور یہی کھیل میرے جوہر دکھانے میں معاون ثابت ہوا۔"(۳)

سکول بدلنے کی وجہ سے شعیب خالق کا ایک سال ضائع ہوا تو اس وجہ سے انھوں نے نویں اور دسویں کا امتحان ایک سال میں ہی دیا اور سال بچانے میں کامیاب ہوئے۔جب میٹرک کے امتحان میں کامیابی حاصل کی تو اس کے بعد شعیب خالق نے راولپنڈی کے معروف کالج گورڈن کالج میں داخلہ لیا اور یہاں پر تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی۔اس کالج نے بھی ان کی خداداد صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں کردار ادا کیا۔سکول کی تعلیم کے دوران اساتذہ کی توجہ حاصل کرنے والے شعیب خالق نے اس اعتماد کی بدولت گورڈن کالج کے اندر بھی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا اور فرسٹ ائیر میں ہی گورڈن کالج لٹریری سوسائٹی کے جوائنٹ سیکرٹری نامزد ہوئے۔اس طرح سکینڈ ائیر میں پہنچ کر یونین کے جنرل سیکرٹری کا الیکشن جیتنے میں کامیاب ہوگئے۔

شعیب خالق کے کالج کے دوستوں کا ذکر کیا جائے تو ان کے بقول آج بھی ان سے تعلق موجود ہے۔کالج کے دوستوں سے مل کر اکثر وہ اپنی یادیں تازہ کرتے ہیں۔ان دوستوں سے مل کر کالج کے دور کے اندر انھوں نے نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں حصہ لیا۔شعیب خالق کالج میں یونین کے علاوہ کالج میں ہونے والی ادبی سرگرمیوں میں سرگرم رکن رہے۔ان کے دوست ان کو آگے لانے کے لیے حوصلہ افزائی کرتے رہے جس سے ان کے اعتماد میں اضافہ ہوا۔اپنے دوستوں کے حوالے سے ان کا کہنا ہے:

> "میرے دوست میرے لیے قیمتی سرمایہ ہیں۔ان دوستوں کی شخصیت سے میں نے بہت کچھ سیکھا۔نصابی اور ہم نصابی سرگرمیوں میں دوستوں کی حوصلہ افزائی ہی کی بدولت آگے آنے کے مواقع میسر آتے رہے۔دوستی کا رشتہ اس قدر گہرا تھا کہ آج بھی تعلق اسی طرح سے مضبوطی سے جڑا ہوا ہے۔"(۴)

شعیب خالق کے دوستوں نے ہمیشہ ان کی حوصلہ افزائی کی۔ وہ ان کی خداداد صلاحیتوں سے خوب واقف تھے اس لیے انھوں نے شعیب خالق سے بھرپور تعاون کیا اور کالج کی ادبی سرگرمیوں میں ان کی شمولیت کے لیے حوصلہ افزائی کیا۔ ان کے قریبی دوستوں میں شاہد مسعود، شیخ رشید، راجہ انور اور پرویز رشید جیسے دوست شامل ہیں جن سے آج بھی ان کی یادیں جڑی ہوئی ہیں۔

شعیب خالق کے اساتذہ نے قدم قدم پر ان کا ساتھ دیا۔ ان کی شخصیت کو نکھارنے میں ان کے اساتذہ نے اہم کردار ادا کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اردگرد اچھے اور محبت کرنے والے لوگ تھے۔ ان سے آپ کو بہت پیار ملا۔ ان سے جڑی ہوئی ہر بات آپ کو آج بھی یاد ہے۔ یہ بھی ان کا اثر ہے کہ آپ کو ادبی دنیا کے اندر شفیق اور محبت کرنے والے کے طور پر جانا جاتا ہے۔ لہذا جب آپ کے ساتھ کچھ وقت گزارا جاتا ہے تو شفقت اور محبت کے پہلو آپ کی شخصیت سے نظر آتے ہیں۔ اساتذہ نے ہر موقع پر ان کی رہنمائی کی۔ کلاس سے سٹیج پر آنے تک کا حوصلہ ان کو اساتذہ ہی کی بدولت ملا۔ عملی زندگی میں بھی ان کی شخصیت کے اندر اعتماد، صبر اور حوصلہ افزائی اساتذہ کی بدولت آج بھی موجود ہے۔ اپنے اساتذہ کے حوالے سے شعیب خالق کا کہنا ہے:

> "میرے اساتذہ مجھ پر بے حد شفیق تھے۔ انھوں نے میری شخصیت کو نکھارنے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ یوں تو بہت سارے اساتذہ نے میری رہنمائی کی لیکن توصیف تبسم اور اجمل نیازی صاحب میرے دو ایسے استاد ہیں جنہوں نے کمال درجہ مجھ پر شفقت فرمائی۔ ان دونوں اساتذہ سے مجھے اردو ادب پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔ جس سے ادب کے ساتھ میری وابستگی اور محبت وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی گئی۔"[۵]

ملازمت:

ملازمت کے سلسلے میں شعیب خالق کو کافی تگ ودو کرنا پڑی۔ شعیب خالق نے اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر عملی زندگی کا آغاز "ایکس رے ویلڈر" کے ڈپلومے سے شروع کیا۔ کراچی کے شہر کورنگی چلے گئے۔ سات ماہ گزارنے کے بعد اردن روانہ ہو گئے لیکن وہاں مستقل سکونت اختیار نہ کر سکے۔ اردن میں چند ماہ قیام کے بعد اپنے دوستوں کے ہمراہ یورپ جانے کا پروگرام بنایا۔ آسٹریا کا ویزہ لے کر پہنچ گئے وہاں پہنچ کر جرمنی کا بارڈر کراس کرنے کی کوشش کیا اور بارڈر کراس کرنے کے دوران ہی پکڑے گئے۔ اس کے بعد انھیں جرمانہ ادا کرنا پڑا اور پندرہ دنوں کے بعد آسٹریا سے نکال دیا گیا۔ گھر والوں کے ڈر کی وجہ سے وطن واپس نہ لوٹے اور وہیں سے ایران کی طرف روانہ ہو گئے لیکن ایران میں بھی زیادہ عرصہ نہ ٹھہر سکے۔ اس کی وجہ یہ

تھی کہ وہاں پر ان کو کوئی خاطر خواہ روز گار نہ مل سکا۔ ذریعہ روز گار نہ ہونے کی وجہ سے ایران کو چھوڑ کر افغانستان چلے آئے۔ ذریعہ روز گار کی تلاش میں کابل میں چند ماہ قیام کیا۔ یہاں بھی ان کو کوئی مستقل روز گار میسر نہ آیا۔ یوں پے در پے ناکامیوں نے ان کے پاؤں کہیں بھی جمنے نہ دیے۔ بالآخر وطن واپس آ گئے۔ وطن واپس آئے تو ان کی والدہ کی حالت تشویش ناک صورتحال اختیار کر گئی۔ گردوں کے ناکارہ ہونے کے سبب وہ خالق حقیقی سے جا ملیں۔ یہی وہ دور تھا جب شعیب خالق پاکستان میں بیک وقت دو نوکریاں کر رہے تھے۔ نوشیلہ انجم رقمطراز ہیں:

> "شعیب خالق کی عملی زندگی کا آغاز پڑھائی چھوڑ کر ایکس رے ویلڈر کا ڈپلومہ لینے سے شروع ہوتا ہے۔۔۔ دوستوں کے ساتھ یورپ میں رہنے کا پروگرام بنایا اور آسٹریا کا ویزہ لیا اور وہاں پہنچے۔۔۔ کچھ عرصہ کابل میں رہے۔ یوں عملی زندگی میں پے در پے ناکامیوں نے کہیں بھی پاؤں نہ جمنے دیئے۔"(٦)

والدہ کے جانے کے بعد ان کے کندھوں پر ذمہ داری بڑھ گئی۔ اپنی دو چھوٹی بہنوں، ایک چھوٹا بھائی اور والد صاحب کی ذمہ داری ان پر عائد ہو گئی۔ پے در پے ناکامیوں کے بعد بالآخر انہیں سرکاری نوکری ٹور ازم مل گئی جس کی بدولت وہ اپنے خاندان کی کفالت کرنے لگے۔ ۱۹۸۵ء تک وہ اسی ملازمت سے وابستہ رہے اس کے بعد ٹی وی پر پرائیویٹ چینل کے ساتھ بھی اپنی خدمات سرانجام دیتے رہے۔ اپنی پیشہ ورانہ زندگی کے حوالے سے ان کا کہنا ہے:

> "ایک اچھے روز گار کی تلاش میری آرزو رہی۔ اس کے لیے میں نے بیرون ممالک بھی سفر کیا اور اپنے قدم جمانے کی کوشش کی۔ قسمت کی دیوی مجھ پر مہربان نہ ہوئی۔ تاہم اچھے کی امید میں سفر جاری رکھا۔ بالآخر پاکستان کے اندر آ کر سرکاری نوکری ٹور ازم مل گئی جس سے خاندانی کفالت میں کافی مدد ملی۔"(٧)

شعیب خالق ۱۹۸۵ء میں شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔ ان کی اہلیہ کا نام سمیعہ بیگم ہے جو انتہائی نفیس مزاج کی مالک ہیں۔ ان کا تعلق ایک باذوق اور پڑھے لکھے گھرانے سے ہے۔ شادی سے قبل سمیعہ بیگم شعبہ تدریس سے وابستہ تھیں اور شادی کے بعد بھی انھوں نے اس سلسلے کو جاری رکھا۔ سمیعہ بیگم نے شعیب خالق کے ساتھ مل کر خوشگوار زندگی کا آغاز کیا۔ اس شادی کے بندھن میں بندھ جانے کے بعد شعیب خالق کا کہنا ہے:

"شادی کے اس بندھن کے حوالے سے ان کی بڑی بہن کا بڑا کردار تھا۔ انھوں نے اس رشتے کے لیے ان کی بڑی مدد کی۔ گھر کے تمام معاملات انھوں نے مل کر طے کیے۔ شادی میں دوستوں نے بھی رونق جمائی۔ سمیعہ بیگم نے بہت اچھے طریقے سے ان کے گھر کو سنبھالا اور ایک اچھی بیوی ثابت ہوئیں جس نے تمام خاندانی رشتوں کو آپس میں جوڑ کر رکھا۔"(۸)

ادبی زندگی:

اگر شعیب خالق کی شخصیت کا جائزہ لیا جائے تو بچپن سے ہی انہیں لکھنے کا شوق تھا۔ وہ کچھ نہ کچھ خیالات کو قلم کی شکل میں تحریر کرتے رہتے تھے۔ اردو ادب میں ان کی پہچان ایک فکشن نگار کے حوالے سے ہے اور موجودہ دور کے فکشن نگاروں میں ان کی پہچان کی ایک وجہ ان کا ادب سے جنون کی حد تک لگاؤ ہے۔ شعیب خالق کی ادبی زندگی کا آغاز تو بہت آگے چل کر ہوا۔ البتہ بچپن کے زمانے میں سکول کی سرگرمیوں میں حصّہ لیتے تھے۔ سکول میں بزم ادب کے روحِ رواں کے طور پر مشہور تھے۔ اس حوالے سے وہ خود بھی مختلف پروگراموں میں حصّہ لیتے اور دوسرے ساتھیوں کو آگے لانے کے لیے حوصلہ افزائی کرتے۔ سکول کے زمانے میں طنز و مزاح سے بھی ان کو شغف رہا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اس طالب علمی کے زمانے میں لطیفے، اقوال زریں اور اداکاری سے سکول کی رونق دوبالا کرنے کے حوالے سے شہرت حاصل کی۔ شعیب خالق اس حوالے سے کہتے ہیں:

"زمانہ طالب علمی میں بالخصوص سکول کی زندگی مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔ جب میں نے اس وقت ایک ڈرامہ بنایا تھا جس کا نام "بدھو نوکر" تھا۔ اس میں مرکزی کردار بھی میں نے خود ادا کیا تھا اور ساتھیوں کو شرکت کرنے کے لیے مدعو بھی کیا اور انہیں تیاری بھی کروائی۔ اس ڈرامے کو سکول کے اندر بہت پزیرائی ملی۔ اساتذہ سمیت سب لوگوں نے میری تعریف کی۔"(۹)

شعیب خالق کو شاعری سے بھی کافی لگاؤ رہا۔ انھوں نے کالج کے زمانے میں شعر لکھنا شروع کر دیئے۔ انہوں نے پوٹھوہاری زبان میں "ترے لیکی" کے نام سے شاعری کے حوالے سے ایک کتاب لکھی۔ یہ کتاب ۲۰۰۵ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں پوٹھوہاری زبان میں ان کے خوبصورت اشعار موجود ہیں۔

اس حوالے سے ان کا کہنا ہے:

"بچپن سے ہی مجھے شعر وشاعری سے خاصا لگاؤ تھا۔ مختلف شاعروں کی شاعری کو شوق سے پڑھتا تھا۔ کالج کے زمانے میں شاعری کی طرف مائل ہوا۔ پوٹھوہاری زبان سے محبت کی وجہ سے زیادہ تر شعر پوٹھوہاری زبان میں لکھے۔"(۱۰)

شعیب خالق کے دوست ان کی خداداد صلاحیتوں سے واقف تھے ان کے ایک دوست شاہد مسعود نے ان کی صلاحیتیں دیکھ کر انہیں سمجھایا تھا کہ تمہاری تقریریں اور تمہاری باتیں دیکھ کر مجھے ایسا لگتا تھا کہ تمہیں شاعری کی بجائے اپنی توجہ نثر کی جانب مبذول کرنی چاہیے اس حوالے سے نوشیلہ انجم لکھتی ہیں: "شاہد مسعود صاحب نے انہیں سمجھایا کہ شاعری واری چھوڑو اور نثر لکھو، جو تمہاری باتوں اور تقریروں کی صورت میں زیادہ نمایاں دکھائی دیتی ہے۔"(۱۱)

شعیب خالق اپنی ادبی زندگی میں انشائیہ نگاری کی طرف بھی راغب ہوئے۔ انشائیہ نثری ادب کی ایک ایسی صنف ہے جو ہوتی تو مضمون کی طرح ہے لیکن مضمون سے اپنی ایک الگ حیثیت رکھتی ہے اور انشائیہ نگار بھی آزادانہ طور پر اپنی تحریر کو اس انداز سے لکھتا ہے کہ انشائیہ نگار کی شخصیت بھی اس میں نظر آتی ہے۔ انشائیہ بغیر کسی نتیجے کے ختم ہو جاتا ہے۔ شعیب خالق نے بھی انشائیہ نگاری کے اندر طبع آزمائی کی اور اپنا انشائیہ "آوارہ گردی" کے نام سے لکھا۔ اس انشائیہ کے اندر ان کی شخصیت واضح طور پر نظر آتی ہے۔

انشائیہ لکھنے کے بعد آپ نے افسانہ نگاری میں طبع آزمائی کی۔ مختلف ادوار میں مختلف کہانیاں لکھتے رہے۔ یہ کہانیاں کہیں نہیں چھپی تھیں۔ ۱۹۸۰ء میں ان تحریروں کو اکھٹا کیا اور کتابی شکل میں ترتیب دیا۔ "بے حرف لفظ" کے نام سے یہ کتاب منظر عام پر آئی۔ یہ کتاب لکھتے وقت کچھ لفظ دیس کے لفظ تھے اور لوگوں سے ملاقات کے ذریعے بہت سارے لفظ ان کے ذہن میں تھے۔ ماضی، حال اور مستقبل کے حوالے سے بہت سارے لفظ سوالات کی شکل میں اکھٹے ہوتے گئے۔ یہی لفظ کسی نہ کسی مضامین پر مبنی تحریر کی صورت میں لکھتے رہے اور بالآخر یہ ایک کتابی صورت میں منظر عام پر آ گئے۔ اس وجہ سے انھوں نے اس کتاب کا نام بے حرف لفظ رکھ دیا۔ یہ جدید افسانوں پر مبنی ایک کتاب ہے جو ۱۹۹۰ء میں دانیال پبلیشرز کراچی سے شائع ہوئی۔

شعیب خالق کا دوسرا مجموعہ ناولٹ "آنٹی" کی صورت میں منظر عام پر آیا۔ ناولٹ کو مختصر یا چھوٹا ناول بھی کہا جا سکتا ہے۔ نثر میں ایسی تحریریں جو ناول سے چھوٹی ہوتی ہیں اور افسانے سے طویل ہوتی ہیں ان کو

ناولٹ کہا جاتا ہے۔ شعیب خالق کا دوسرا مجموعہ "آنٹی" کی صورت میں مختصر ناول یا طویل افسانے کے طور پر سامنے آیا۔ یہ مجموعہ دوست پبلیشرز اسلام آباد سے ۲۰۰۱ء میں شائع ہوا۔

تیسرا مجموعہ شاعری کی صورت میں پوٹھوہاری زبان میں "تیرے لیکی" کے نام سے ۲۰۰۵ء میں منظر عام پر آیا۔

اس کے علاوہ شکر پڑیاں انگلش طویل نظم راجہ چنگیز سلطان کا پوٹھوہاری اور اردو ترجمہ کیا اور "رائل سیلوٹ" کے نام سے افسانہ لکھا اس طرح "ٹی وی ڈرامہ کیسے لکھا جاتا ہے" کے حوالے سے ایک کتاب لکھی۔

۲۰۰۵ء کے بعد ان کے افسانے مختلف ادبی جرائد مثلاً جنگ، اوراق، دستاویز وغیر میں شائع ہوتے رہے۔

۲۰۰۵ء کے طویل عرصے بعد ۲۰۱۹ء میں ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ "چھتری نما کہانیاں" کے نام سے رمیل ھاؤس آف پبلی کیشنز سے شائع ہوا۔ اس میں سادہ اسلوب میں کہانیاں اس انداز سے پیش کی گئی ہیں کہ عام قاری بھی ان کہانیوں کو آسانی سے پڑھ سکتا ہے۔ ان کہانیوں کو پڑھنے کے بعد سارے مناظر ایسے دکھائی دیتے ہیں جیسے یہ ہمارے ارد گرد کی سچی تصویر ہو۔ شعیب خالق کے اس افسانوی مجموعے میں جہاں موضوعات کا تنوع ہے وہاں اس مجموعے میں جدید معاشرہ کے فرد کے داخلی اور خارجی مسائل کا موضوع بھی اہم ہے۔

شعیب خالق ایک ہمہ جہت شخصیت ہیں۔ انھوں نے افسانہ و ناول نگار اور علاقائی زبان و لہجہ کے شاعر کے طور پر بھی لوگوں کی توجہ حاصل کر کے شہرت حاصل کی ہے۔ ایک فکشن نگار کی حیثیت سے انھوں نے لوگوں کے سامنے حقائق کو رکھا ہے اور انھیں خیال دنیا کی بجائے حقیقی دنیا کی زندگی کا احساس دلوانے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے فرد کے داخلی اور خارجی مسائل کو اس انداز سے بیان کیا ہے کہ فرد کے سامنے زندگی کی حیثیت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔

شعیب خالق کو زیادہ شہرت و پہچان ٹی وی ڈرامے کی معرفت سے ملی۔ ان کا پہلا ٹی وی ڈرامہ "پتلی چاچا" تھا۔ اس ڈرامے کو پاکستان اور پوری دنیا کے اندر پذیرائی ملی۔ ہندوستان کی پونا اکیڈمی نے اس ڈرامے کو اپنی ڈرامہ آرکائیوز میں جگہ دی۔ یہ شعیب خالق کے لیے بہت بڑا اعزاز تھا۔ شعیب خالق نے چائلڈ لیبر کے موضوع پر بننے والی ڈرامہ سریل میں ایک ڈرامہ "ایک روپیہ روزانہ پیش کر کے کافی زیادہ شہرت حاصل کی۔ اس حوالے سے انھیں بہترین ڈرامہ نگار کی حیثیت سے نیشنل ایوارڈ دیا گیا۔ وہ پی ٹی وی اسلام آباد سینٹر

کے پہلے ڈرامہ نگار بن گئے جس نے بہترین ڈرامہ نگار کا ایوارڈ حاصل کیا ہو۔

علاقائی ڈرامہ " بر د بر آمد " لکھنے کے حوالے سے بھی شعیب خالق نے کافی شہرت حاصل کی۔ اس ڈرامے کو اس قدر پذیرائی ملی کہ اس ڈرامہ کی بدولت انہیں بہترین علاقائی ڈرامہ نگار کے پی ٹی وی ایوارڈ سے نوازا گیا جو یقیناً ایک اعزاز ہے۔

شعیب خالق کی شہرت یہاں تک ختم نہیں ہوتی۔ معروف اور عوام میں مقبول ڈرامہ سریل " گیسٹ ہاؤس اور " فلمیریا ان لینڈ " کے لکھنے والوں میں ان کا نام شامل رہا۔ ۲۰۱۷ء میں ان کی شہرت یافتہ کتاب " ٹی وی ڈرامہ کیسے لکھا جاتا ہے " منظر عام پر آئی۔ اس کتاب کو اکادمی ادبیات پاکستان نے شائع کیا اور اس کتاب کی شہرت اس حد تک مقبول ہوئی کہ بحریہ یونیورسٹی اسلام آباد کے میڈیا ڈیپارٹمنٹ میں بھی پڑھائی جانے لگی۔

ج۔ جدید معاشرہ اور فرد کے مسائل

انسانی معاشرہ کا تصور اتنا ہی قدیم ہے جتنا انسان خود۔ معاشرے سے مراد افراد کا ایک ایسا گروہ ہوتا ہے جس میں افراد اپنی بنیادی ضروریات پوری کرنے کے لیے ایک دوسرے سے مشترکہ روابط قائم کرتے ہیں۔ ایک ہی قوم اور ایک ہی مذہب سے معاشرہ مراد نہیں لیا جاتا بلکہ کسی خاص مذہب کی تاریخ کے حوالے سے اور خاص قوم کے حوالے سے جب بات کی جاتی ہے تو اس کے نام کے ساتھ معاشرہ کا بھی اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ جیسے کہ اسلامی معاشرہ، مغربی معاشرہ، ہندوستانی معاشرہ وغیرہ۔ جس میں مختلف گروہوں کے لوگ اپنی بنیادی ضروریات پوری کرنے کے لیے ایک دوسرے پر انحصار کرتے ہیں کیونکہ کوئی بھی فرد اکیلا زندگی بسر نہیں کر سکتا اور نہ ہی اپنی ضروریات زندگی کو اکیلا پورا کر سکتا ہے۔ ہر فرد کو دوسرے فرد کی ضرورت در پیش ہوتی ہے۔ معاشرہ کے اندر ہی ایک انسان کو مساوی انسان کا حق دیا جاتا ہے۔ انسان سے ہی ایک گھر بنتا ہے اور ایک گھر سے پورا معاشرہ تخلیق پاتا ہے۔ معاشرہ کی تشکیل انسان کی بدولت ہوتی ہے۔ جب ایک انسان دنیا میں آتا ہے تو اسے کسی اچھائی اور برائی کا پتا نہیں ہوتا۔ معاشرہ ہی ایک فرد کو اچھا انسان بننے اور مجرم بننے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ عام طور پر اگر ایک بچہ پڑھے لکھے گھر میں پیدا ہو تو اس کا کردار بھی اچھا ہو گا اور معاشرہ میں معزز انسان بنے گا اور اگر اس کے برعکس کوئی بچہ بد اخلاق، ان پڑھ معاشرے میں آنکھ کھولتا ہے تو اس پر اس معاشرے کے منفی اثرات براہ راست مرتب ہوتے ہیں اور مجرم بننے اور بُرا بننے کا باعث بنتے ہیں کیونکہ معاشرہ فرد کے اچھا انسان بننے اور مجرم بننے میں اہم کردار ادا کرتا ہے جہاں فرد سے

معاشرہ تشکیل پاتا ہے وہیں گذشتہ کئی صدیوں سے انسانی معاشرے نے سادہ چھوٹی زرعی کمیونٹی سے بڑی پیچیدہ صنعتی بلدیہ عظمیٰ کی شکل اختیار کر لی ہے۔ شروع میں انسان نے خوراک کی تلاش میں، شکار، جنگلی پھلوں اور سبزیوں پر اکتفا کیا اور اس طرح بعد میں انسانوں نے جانوروں کو سدھار کر خوراک اور لباس کی ضرورت پوری کی۔ پھر (Pastoral Society) میں خانہ بدوشانہ انداز کو برقرار رکھ کر ایک ہی جگہ رہائش اختیار کی اور سبزیوں وغیرہ کی کاشت شروع کی جس کی بدولت خوراک کے حصول اور اس کا ذخیرہ کرنا نسبتاً سہل ہوتا گیا۔ Horiticultural societyہارٹیکلچرل سوسائٹی میں ہل کی ایجاد نے کاشکاروں کو جدید سہولیات سے آراستہ کر دیا جس سے زراعت کے شعبہ میں جدت آئی۔ آج سے تقریباً چھ ہزار سال قبل زرعی معاشرہ ہارٹیکلچرل سوسائٹی وجود میں آئی جس کی بدولت معاشرتی ادارے قائم ہوئے اور آبادی میں اضافہ ہوا۔ معاشرتی طبقات، ضروریات زندگی کی طلب میں اضافہ، علوم وفنون کی ترقی، نئی ایجادات، نئی دریافتیں، دستکاریوں کا صنعتی روپ کی شکل میں سامنے آنا اور معاشرے میں صنعتی انقلاب یہ سب معاشرے میں ایسے تغیرات ہیں جنہوں نے معاشرے اور فرد کو مکمل طور پر بدل کر رکھ دیا۔ اس سے معاشرے اور فرد کی زندگی میں انقلاب برپا ہو گیا۔ ڈاکٹر وحید عشرت رقمطراز ہیں:

> "قدیم انسان پھل، پتوں اور جڑوں پر گزر اوقات کرتا اور غاروں اور درختوں میں رہتا تھا۔ مگر جب اس نے پتھر اور لوہے کے اوزار بنائے۔ اس نے مچھلی کو اور شکار کو بھون کر کھانے، تیر کمانے بنانے، زرعی آلات ایجاد کرنے کے بعد ٹیکنالوجی کے ابتدائی دور میں قدم رکھا تو اسے ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ نئی سیاسی اور سماجی تکنیک سماج اور ریاست کو بھی وجود میں لائے۔"(۱۲)

معاشرے کا مفہوم اردو میں مختلف حوالوں سے موجود ہے اس سے اجتماعیہ، سماج، تہذیب و تمدن، بیت اجتماعی، جماعت مراد لیا جاتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر فرد کو رہنے سہنے کے حوالے سے جماعتی زندگی میں اپنی ترقی اور فلاح کے لیے دوسروں سے واسطہ پڑتا ہے۔

معاشرہ کے لغوی معنی مل جل کر رہنا اور زندگی بسر کرنا ہے۔

معاشرہ سماج، سوسائٹی، رفاقت، لوگوں کا گروہ جو کسی مشترکہ مقصد کے لیے باہمی متحد ہو خصوصاً ادبی، سائنسی، سیاسی، مذہبی، فلاحی مقاصد یا شادمانی وغیرہ کے لیے۔

ایک ساتھ اجتماعی زندگی گزارنے کے لیے معاشرہ اور تعاشر (اس سے "عشیرہ" خاندان کے لیے اور "معشر" قبیلہ و گروہ کے لیے مشتمل رہا ہے۔

باہم مل جل کر رہنا انسان، ماحول، جماعتی زندگی میں ہر فرد کو رہنے سہنے اور اپنی ترقی و بہبود کے لیے دوسروں سے واسطہ پڑتا ہے۔

موجودہ معاشرہ جدید ترین شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ اس معاشرے کو کئی مراحل سے گزرنا پڑا۔ اس طرح اس ارتقائی سفر میں مختلف معاشرے وجود میں آئے اور تغیر و تبدیلی کے عمل سے گزرے اس طرح ان کی ہیت اور ساخت میں تغیر آتا رہا۔

انسانی زندگی کا ابتدائی معاشرہ ہے جس میں انسان خوراک کے لیے شکار اور جنگلی پھلوں سے اپنی زندگی کا نظام چلاتے تھے۔ چند افراد اور بکھرے ہوئے گروہوں پر مشتمل یہ معاشرہ گروہوں کی شکل میں خانہ بدوشی کرتے تھے۔ اس سے ان کی ضروریات زندگی پوری ہوتی ہے۔ خاندان کے علاوہ دیگر ادارے موجود نہیں ہوتے تھے۔ خاندان ہی مذہبی، تعلیمی اور معاشی ادارہ کے حوالے سے خدمات سر انجام دیتے تھے۔ جائیداد کا تصور مفقود ہونے کی بنا پر دولت مند اور غریب طبقہ کی درجہ بندی نہیں ہوتی تھی۔

گلہ بان جیسے معاشرے تقریباً بارہ ہزار اور دس ہزار سال قبل وجود میں آئے۔ شکاری معاشرے کے لوگوں نے جانوروں کو پکڑ کر اور ان کو سدھا کر اپنی ضروریات زندگی پوری کرنا شروع کر دیں۔ بھیڑ بکریاں اور دودھ انسانی خوراک کا بڑا ذریعہ تھے۔ جانوروں کا دولت اور فالتو معاشی وسائل کا ذریعہ بننے سے آبادی میں اضافہ ہوا اور معاشرے نیم خانہ بدوش اور نیم مقیم کی شکل میں بدل گئے۔ اس سے کچھ افراد زیادہ طاقتور بن گئے۔ اس سے دولت اور غریب کے درجے وجود میں آئے۔ اس کی بدولت معاشی و سیاسی ادارے بھی وجود میں آئے اور معاشرے کی باقاعدہ سربراہی کا بھی آغاز ہونے لگا۔

باغبان معاشرہ اس وقت وجود میں آیا جب معاشرے کے لوگوں نے شعوری کوشش سے پھل اور سبزیوں کو کاشت کرنا شروع کر دیا۔ تقریباً دس اور بارہ ہزار قبل کا یہ زمانہ میدانی علاقوں میں لوگوں کی زندگیوں میں تغیر پیدا ہوا۔ جڑی بوٹیوں کو جلا کر جنگلوں کو اسی دور میں صاف کیا گیا۔ اس سے آبادی میں اضافہ ہوا اور سیاسی اور معاشی ادارے بھی وجود میں آئے۔ جب مختلف معاشروں میں تجارت شروع ہوئی تو اس سے اقامتی معاشرے وجود میں آئے جس کی بدولت گھروں کی تعمیر، دستکاریوں کا آغاز، کاشتکاری کے آلات کی ایجاد اور دیگر ایسے تغیرات آئے جس سے معاشرہ اور اس میں رہنے والے افراد کی زندگی مکمل

طور پر بدل گئی۔

زرعی معاشرہ کی بدولت زراعت کے شعبے میں انقلاب برپا ہو گیا۔ تقریباً چھ ہزار سال قبل ہل کی ایجاد نے زراعت کے شعبے میں جدت پیدا کر دی۔ اس سے زمین سے زیادہ مقدار میں پیدوار حاصل کی جانے لگی۔ ترکھان، موچی، اور جولا جیسے پیشے بھی اسی دور میں قائم ہوئے۔ افراد اور گروہوں کی آبادی میں جہاں ایک طرف اضافہ ہوا وہاں دوسری طرف ان کے روابط بھی آپس میں بڑھے۔ اس سے ریاست کی نمایاں صورت سامنے آئی۔ اس دور میں بھی دولت کے چند ہاتھوں تک مرتکز ہونے کی وجہ سے معاشرہ اعلی اور ادنی طبقہ میں تقسیم ہو گیا۔ ریاست کے وجود سے فوج اور جنگ کا آغاز ہوا۔ فتوحات کی بدولت بڑی بڑی رہائشیں قائم ہوئیں۔

صنعتی معاشرے کے حوالے سے دیکھا جائے تو اس کا آغاز تقریباً اڑھائی صدی قبل کا دور جانا جاتا ہے۔ اس دور میں افراد اور معاشرہ کی زندگی کا انحصار مشینی پیداوار پر ہوا۔ معاشی سرگرمیوں نے نئ شکل اختیار کر لی۔ صنعتی معاشرے نے کام کا بوجھ کم کر دیا ہے۔ دینی اور زرعی معاشرے بلدیاتی معاشرے کی شکل اختیار کر چکے ہیں۔ آبادی میں اضافے اور دیگر سہولیات کی دستیابی نے روزگار کے نئے مواقع میسر کیے ہیں۔

صنعتی معاشرے میں حکومت نے ایک منظم اور پوری زندگی کو محیط کرنے والے ادارے کی شکل اختیار کر لی ہے۔ تعلیمی ادارے بہت اہمیت اختیار کر گئے ہیں۔ سائنسی علوم کا حصول نئ معاشرتی قدروں کے طور پر ابھر کر سامنے آیا ہے۔ فوج، پولیس، اور بیوروکریسی بہت منظم ادارے بن گئے ہے۔ اس طرح ثقافت ایک نئی رخ اختیار کرتی ہے۔ قدیم روایت اور رسم ورواج کی بجائے جدید طرز زندگی کو پسند کیا جاتا ہے۔ اس طرح معاشرے میں انقلاب برپا ہو گیا۔ عبدالمجید سالک رقمطراز ہیں:

> "انسانی ترقی کا مشعل بردار جلوس مسلسل رواں رہتا ہے۔ ارتقاء کی ترقی میں نسلیں اور قومیں افراد ہی کی طرح بے حقیقت ہوتی ہیں۔ افراد بھی اور نسلیں، سلطنتیں اور تہذیبیں بھی گزر جاتی ہیں۔ لیکن انسان آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اصل چیز انسان کی مجموعی ترقی ہے اور اس کی حرکت میں ہم دیکھتے ہیں کہ علیحدہ علیحدہ دھارے مل کر وسیع تر ندیوں کی صورت اختیار کرتے چلے جاتے ہیں۔ ترقی کا مقصد پیش قدمی نہیں بلکہ اس کا مقصد روز افزوں توسیع ہے۔ جو مسلسل طور پر نسل انسانی کو ایک منظم اور مشترک نمو کے وسیع تر دائروں کے اندر شامل کرتے ہیں۔"(۱۳)

انسان سے ایک گھر بنتا ہے اور گھر سے ہی ایک معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ انسان کی فکر پر اس کا کردار منحصر ہے جس کی وجہ سے ایک معاشرہ انسان خود تشکیل دیتا ہے۔ جب انسان کو اپنی بنیادی ضروریات پورا کرنے کے لیے دوسرے انسانوں کی ضرورت محسوس ہوتی تو انسانوں نے ایک دوسرے کے ساتھ روابط قائم کرنا شروع کر دیے تاکہ اپنی بنیادی ضروریات پوری کر سکیں۔ کوئی بھی فرد اکیلے اپنی پوری زندگی بسر نہیں کر سکتا کیونکہ دوسرے انسانوں کے بغیر نہ ہی ایک فرد میں شعور آتا ہے نہ زندگی گزارنے کا سلیقہ آتا ہے۔ اپنی بنیادی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے افراد نے آہستہ آہستہ گروہوں میں رہنا شروع کر دیا کیونکہ اجتماعی زندگی کے بغیر انسانی ضروریات کی تکمیل بھی ممکن نہیں ہو پاتی۔ مثال کے طور پر خوراک انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ کوئی شخص تنہا اپنی خوراک کی ضروریات کو بھی پورا نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اناج پیدا کرنے والے کسان کی ضرورت در پیش ہوتی ہے اور کسانوں کو بھی اپنی زراعت کی ضروریات کے لیے لوہاروں اور بڑھئی کی ضرورت ہوتی ہے۔ مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد تیار شدہ خوراک فرد تک میسر ہوتی ہے جس کی وجہ سے معاشرہ وجود پذیر ہوا۔ معاشرے کے ارتقاء کی ایک اہم وجہ دشمنوں کے حملوں کا خطرہ بھی تھا۔ جس کی وجہ سے انسانوں نے ایسے منظم گروہوں کی ضرورت پیش کی جس میں وہ اپنے آپ کو محفوظ کر سکیں۔

اسلام کے مطابق انسان کے اندر ابتداء ہی سے بہت سی صلاحیتیں موجود ہوتی ہیں۔ مگر فرد واحد تنہا کبھی بھی اپنی صلاحیتوں کو نکھار نہیں سکتا اور ایک اجتماع کے بغیر نہ ہی اس فرد کی صلاحیتیں بروے کار لائی جا سکتی ہیں جس میں رہ کر فرد دوسرے افراد کی مدد سے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا سکتا ہے

ڈاکٹر احمد رضا لکھتے ہیں۔

> "انسان مدنی الطبع ہے اور اس میں مل جل کر زندگی بسر کرنے کا فطری رجحان ہے۔ اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے وہ دوسروں کا محتاج ہے۔ سیدنا آدم علیہ اسلام اور سیدنا حوا اسلام اللہ کے زمین پر آباد ہونے کے ساتھ ہی پہلا انسانی معاشرہ معرض وجود میں آیا۔"(۱۴)

فرد اکیلے اپنی تربیت نہیں کر سکتا اسے ہمیشہ سماج یا معاشرے کی ضرورت در پیش ہوتی ہے۔ کیونکہ معاشرہ اپنی مختلف اکائیوں کے ذریعے مدرسہ، خاندان اور پڑوس وغیرہ ایسی اکائیاں ہیں جن کی وجہ سے معاشرہ میں موجود فرد کی سماجی تربیت کی جاتی ہے۔ ڈاکٹر شعیب عتیق خان رقمطراز ہیں:

> "زمین، نسل اور ثقافت معاشرہ کے تشکیلی عناصر کا کردار ادا کرتے ہیں۔ مارکس کے

> نزدیک معاشرہ کی حقیقی بنیاد اور اس کا حقیقی سرچشمہ افراد کے درمیان معاشی رشتوں میں پوشیدہ ہے۔ معاشرے کے تشکیلی عناصر میں زمین، نسل اور ثقافت کے ساتھ ساتھ معاشی رشتوں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح کچھ اور عناصر ہیں جو تشکیل معاشرہ میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔"(۱۵)

مختلف خطرات ہر وقت کسی نہ کسی صورت میں موجود ہوتے ہیں اور انسان تنہا ان خطرات کا مقابلہ نہیں کر سکتا جس کی وجہ سے معاشرہ معرض وجود میں آیا۔ کیونکہ معاشرے سے پہلے انسانی جان ومال کو کوئی تحفظ نہیں تھا۔ لوگ ایک دوسرے کو جانوروں کی طرح چیر پھاڑ کر کھا جاتے تھے۔ لیکن ان خطرات کے خاتمے کے لیے افراد نے اجتماع میں رہنا شروع کر دیا۔ اجتماع میں رہنے کے بعد انسانوں کے جان ومال کے تحفظ کے لیے معاشرے کے اندر قوانین تشکیل دیئے گئے جس کی وجہ سے انسانی جان محفوظ ہوگئی۔ کیونکہ معاشرہ مختلف نظریات کے مجموعوں پر مبنی ہوتا ہے اور وہ مستحکم بھی اس وقت ہی ہو سکتا ہے جب وہ نظریاتی رویوں اور اداروں کے حوالے سے مضبوط ہو اور نظریات کی وجہ سے معاشرہ کی بقاء ہوتی ہے۔

ڈاکٹر خالد علوی لکھتے ہیں۔

> "ہر معاشرہ کسی نظریہ یا نظریات کے مجموعوں پر مشتمل ہوتا ہے کیونکہ نظریات ہی معاشروں کی تشکیل کرتے ہیں۔ ان نظریات کی وجہ سے بعض رویے تشکیل پاتے ہیں اور ان رویوں کے نتیجے میں ادارے تشکیل پاتے ہیں۔ مستحکم معاشرے اپنے نظریات، رویوں اور اداروں کے استحکام کے بارے میں حساس ہوتے ہیں اور آسانی سے انہیں تبدیل نہیں ہونے دیتے۔ تاہم بعض داخلی اور خارجی عوامل ایسے ہوتے ہیں جو یہ تغیر پیدا کرتے ہیں۔"(۱۶)

تنہائی کا احساس فرد کی شخصیت میں بہت ساری خامیاں پیدا کرنے کا باعث بنتا ہے۔ انسان فطرتاً گروہ پسند ہے اور گروہی جبلت رکھتا ہے۔ کیونکہ اکیلے فرد کی زندگی غیر مطمئن ہوتی ہے اور معاشرے کے ذریعے ہی گروہی جبلت کا سامان پیدا ہوتا ہے۔ گروہ میں رہنے والے افراد نہ صرف اپنی بنیادی ضروریات پوری کر سکتے ہیں بلکہ ذہنی سکون میں بھی تسکین حاصل کرتے ہیں۔

ابتدائی سطح پر معاشرہ کی صورتحال بہت مختلف تھی۔ مختلف تاریخی ادوار میں گزرنے کے بعد معاشرے میں بہت ساری تبدیلیاں رونما ہوئیں اور معاشرے کی تشکیل کا باعث بھی بنیں۔ جوں جوں وقت

گزرتا گیا انسان کی ضروریات میں بھی اضافہ ہوتا گیا اور وقت کے ساتھ ساتھ معاشرے میں انسانی ضروریات پہلے سے زیادہ بڑھ گئیں۔ معاشرہ ہی انسانی ضروریات کو پورا کرنے کا باعث بنتا ہے۔ کیونکہ فرد اپنی ضروریات کی تکمیل کے لیے صرف اپنے آپ پر انحصار نہیں کر سکتا اور یہی ارتقاء و ترقی کا عمل انسانی تہذیب میں مسلسل جاری رہتا ہے۔ فطرت کی رنگینیوں میں جس قدر انسان ڈوبتا ہے وہ اس قدر فطرت کے مناظر اور حسن سے آشنائی حاصل کرتا ہے۔

ارشد محمود لکھتے ہیں۔

"انسان جو چیز تخلیق کرتا ہے اسے اس کے حسن کے معیار پر پہنچانا چاہتا ہے جس میں اس کے محبوب کا عکس دکھائی دے سکے۔ لیکن کچھ دیر بعد وہ اس کے معیار سے غیر مطمئن ہو جاتا ہے اور اسے پھر سے تبدیل کر کے مزید خوبصورت اور بہتر بناتا ہے۔ یوں ارتقاء و ترقی کا عمل انسانی تہذیب میں جاری و ساری ہے۔ چنانچہ کوئی قوم فطرت کی نیرنگیوں اور حسن کارکردگی کی گہرائی میں جتنا ڈوبتی ہے، اتنے ہی حسینہ فطرت اس پر اپنے التفات کی بارش کر کے ان کی زندگیوں میں خوبصورتیاں اور سرفرازیاں بھر دیتی ہے۔"(۱۷)

فرد اور معاشرے کا تعلق:

فرد اور معاشرے کا تعلق آپس میں لازم و ملزوم ہے۔ فرد کی اہمیت معاشرے ہی سے جڑی ہے۔ انسان نے ابتداء میں مختصر گروہ میں رہنا شروع کیا اور بعد میں یہی گروہ بڑے منظم ہو گئے۔ فرد اور معاشرے کے تعلق کے حوالے سے ڈاکٹر وحید قریشی نے "فلسفہ عمرانیات" میں، عبد المجید سالک نے "تشکیل انسانیت" میں، جمیل جالبی نے "پاکستانی کلچر" میں لکھا ہے۔ اس حوالے سے تجمل حسین عباسی نے اپنی کتاب "ہمارا معاشرہ" میں اس حوالے سے لکھا ہے:

"معاشرہ فرد کے بغیر اور فرد معاشرے کے بغیر کوئی وجود نہیں رکھتا۔ اس لیے بعض ماہرین معاشرہ کو ایک جسم اور فرد کو اس کے ایک عضو سے تشبیہ دیتے ہیں۔ جس طرح جسم کے مختلف اعضاء اپنا اپنا کام مخصوص طور پر کرنے کے باوجود باہمی طور پر ایک دوسرے کے محتاج ہوتے ہیں اور مل کر تمام کام سرانجام دیتے ہیں۔ اسی طرح معاشرہ کے افراد اپنے اپنے کام اور باہمی تعلقات سے معاشرے کا نظام قائم رکھتے

ہیں۔ جسم اپنے وجود کے لیے اعضاء کا محتاج ہے اور اعضاء کی زندگی جسم کے وجود سے قائم رہتی ہے۔"(۱۸)

انسان کی زندگی مختلف ادوار میں مختلف گروہوں میں گزر رہی ہے۔ بلکہ منظم یا غیر منظم معاشرہ نہ صرف انسان کی ضروریات کے لیے ضروری ہے بلکہ معاشرے کے اندر ہی افراد کی تربیت اور نشوونما بھی ہو رہی ہے۔ ارسطو نے انسان کو سماجی حیوان کے لقب سے نوازا ہے یعنی مل جل کر رہنے کے تصور کو سماجی حیوان کہا جاتا ہے۔ کیونکہ انسانی ضروریات کا تعلق ایک دوسرے ہی سے جڑا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان ایک سماج کی شکل میں رہتا ہے۔

ڈاکٹر احمد رضا لکھتے ہیں:

"فرد اور اس کے معاشرتی ورثے کے درمیان اس بنیادی اور فعال بقائے باہمی کے رشتے کا ادراک ہمیں ارسطو کے اس مشہور جملے کی صداقت کا احساس دلاتا ہے۔ جس میں اس نے کہا تھا کہ انسان ایک معاشرتی حیوان ہے۔ معاشرتی زندگی اور معاشرے کے بارے میں فرد کے رویوں کے اختلاف کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ معاشرے کے بغیر اور معاشرتی رویے کی حوصلہ افزائی کے بغیر فرد کی شخصیت کا وجود میں آنا ممکن نہیں۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ معاشرے کا کوئی اجتماعی وجود نہیں۔ معاشرہ افراد کے مجموعے کا نام ہے۔"(۱۹)

آج کے دور کے اندر فرد کی بنیادی ضروریات بآسانی پوری ہو رہی ہیں اس کی وجہ فرد کا اجتماع میں وجود ہے کیونکہ وقت کے ساتھ ساتھ انسانی ضروریات میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ روٹی، کپڑا، اور مکان کے علاوہ بھی بہت ساری ایسی انسانی ضروریات ہیں جس کو پورا کرنے کے لیے فرد کا اجتماع میں ہونا بہت ضروری ہے۔ تب ہی انسان اپنی بنیادی ضروریات کو پورا کر سکتا ہے۔

الغرض ایک دورے پر انحصار، معاشرتی اختلاف، معاشرے کی مستقل تنظیم، باہمی تعاون، معاشرتی غیر تعلق سماجیت اور یکسانیت ایسے عناصر ہیں جو فرد کی زندگی اور بقاء کے لیے ناگزیر ہیں۔

جدید معاشرے میں لفظ جدید قدیم کا متضاد ہے۔ اس قسم کا معاشرہ قدیم قدروں کا حامل نہیں ہوتا بلکہ معاشرے کے جدید تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ ہوتا ہے۔ جدید معاشرے میں نئی اقدار کو اپنایا جاتا ہے۔ زندگی کی بنیادی سہولتیں جیسے تعلیم، صحت، تحفظ، ذرائع آمدورفت وغیرہ آسانی سے دستیاب ہوتے

ہیں۔جدید معاشرے میں نئی اقدار وروایات کی بدولت پرانی اقدار پر ترجیح دی جاتی ہے۔اس معاشرے میں خاندانی منصوبہ بندی کے جدید تقاضوں میں تردید نہیں کی جاتی۔اس سے آبادی کی شرح میں اضافہ نہیں ہوتا۔جدید معاشرہ عام طور پر جدید صنعتی علاقوں یا شہری علاقوں میں زیادہ قائم ہوتا ہے۔جدید صنعت وحرفت کے ساتھ جدید معاشرہ پروان چڑھتا ہے۔تعلیمی،ذہنی اور شعوری ترقی کے ساتھ شہر بندی عام پائی جاتی ہے۔اس طرح معاشرتی معمولات کی کمی وجہ سے انحراف کی شرح بہت زیادہ ہوتی ہے۔ان انحراف کی شکلیں جرائم کی صورت جیسے چوری،ڈاکہ،زنا،اغوااور منشیات کی صورت میں سامنے آتی ہیں۔جدید معاشرے میں بین الاقوامی رابطے،ذیلی سماجی ادارے اور حرکت پذیری کی خصوصیات ہیں۔غلام کبریار قمطراز ہیں:

"ٹیکنالوجی کسی دور کی اور کسی زمانے کی سماجی،سیاسی حالتوں میں اور تاریخی پس منظر میں،یعنی معروضی حالتوں میں اشیاء اور خدمات حاصل کرنے کا آسان سے آسان سستے سے سستہ اور تیز سے تیز طریقہ ہے۔"(۲۰)

جدید معاشرے میں ٹیکنالوجی کی بدولت روزگار کے مواقع،ذرائع مواصلات،وسیع ذرائع آمدن اور معاشرتی درجہ بندی جیسی ایسی خصوصیات ہیں جن کی بدولت جدید معاشرے نے انقلابی شکل اختیار کر لی ہے۔تاہم ان ساری خصوصیات کی بدولت جدید معاشرے نے جہاں افراد کی زندگیوں میں آسانیاں پیدا کی ہیں وہاں دوسری طرف جدید معاشرے کی بدولت بہت سارے مسائل ایسے بھی آئے ہیں جن کی بدولت معاشرہ اور اس میں رہنے والے افراد کو داخلی اور خارجی دونوں سطح پر دشواری کا سامنا کرنا پڑا ہے۔

معاشرہ میں مختلف گروہوں کے حوالے سے عبدالحمید ٹیگا لکھتے ہیں:

"In a society not one or two types of groups are joined together but huge network of various group is interworn.In this way one may assume that a society is an aggregate of individuals.may be right but with an essential conceptual addition of interdependence among the individuals." (۲۱)

کسی معاشرے میں ایک آر نہیں دو قسم کے گروپ ایک ساتھ شامل ہوتے ہیں لیکن مختلف گروہوں کا ایک بہت بڑا نیٹ ورک باہم مل جاتا ہے۔اس طرح ایک نکات ایک معاشرے میں مجموعی افراد کو فرض کر سکتے ہیں۔افراد کے

درمیان باہمی انحصار ایک ضروری تصوراتی اضافے کے ساتھ یہ موقف صحیح ہو سکتا ہے۔

ساٹھ کی دہائی کے بعد جدید معاشرے کا آغاز ہوتا ہے۔ جدید ٹیکنالوجی نے جہاں انسانی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے مختلف سہولیات فراہم کی ہیں۔ نئی نئی ایجادات اور سائنسی تحقیقات نے انسانی زندگی کو پہلے سے زیادہ سہل بنا دیا ہے وہیں قدامت پسند افراد کی قدر و قیمت ماضی کی طرح گھٹ رہی ہے۔ جدیدیت نے نہ صرف لوگوں کا رہن سہن بدلا بلکہ کھانے پینے کے انداز بھی بدل کے رکھ دیئے۔ ہوٹل کے کھانے گھر کے کھانوں سے زیادہ پسند کیے جانے لگے۔ اس طرح لباس کے حوالے سے دیکھا جائے تو روایتی لباس کی جگہ انگریزی لباس پینٹ شرٹ، ٹی شرٹ نے لے لی۔ مردوں کے شانہ بشانہ عورتوں نے بھی اپنے آباؤ اجداد کی طرز کو اپنانے کی بجائے انگریزی لباس کو ہی ترجیح دی جس کی وجہ سے اعضاء کو چھپانے کی بجائے مزید ظاہر اور نمایاں ہونے لگے۔ مغربی تہذیب کا دلدادہ جدید معاشرہ بغاوت کا دوسرا نام ہے۔ لیاقت حسین ہاشمی جدید معاشرے کے حوالے سے لکھا ہے:

"جدید معاشرے کی یہ پیچیدگی صنعتی ممالک میں بتدریج پیدا ہوئی اور موجودہ دور کا پیچیدہ معاشرہ تقریباً 300 سالوں میں اس حالت کو پہنچا۔ بتدریج تبدیلی کے اس عمل نے صنعتی ممالک میں کوئی بحران پیدا نہیں کیا جوں جوں تبدیلی آتی گئی معاشرہ اسے جذب کرتا گیا۔ ان تبدیلیوں کے دوران جو مسائل پیدا ہوئے انہیں ساتھ ساتھ حل کیا جاتا رہا۔ افراد نسل در نسل ان تبدیلیوں کے عادی ہوتے چلے گئے۔"(۲۲)

جدید معاشرے میں مردوں اور عورتوں کے تعلقات کو معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ کیوں کہ اس جدید معاشرے کے اندر اکثر نکاح اور شادی کے بندھن میں بندھنے کی بجائے آزادانہ طور پر ایک دوسرے کے ساتھ ناجائز تعلقات قائم کر لیے جاتے ہیں جس کی وجہ سے جدید معاشرے کے اندر فرد کو بے شمار مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ دیکھا جائے تو جدید معاشرہ کی تباہ کاریوں کو نظر انداز کرنے کی بجائے اس کی خوبیوں کو ہی اجاگر کیا جاتا ہے۔ لیکن جدید ٹیکنالوجی نے نہ صرف فرد پر بلکہ معاشرے پر بھی براہ راست اثرات مرتب کیے ہیں۔

ڈاکٹر خالد علوی لکھتے ہیں:

"کوئی بھی مثبت یا منفی تغیر اجتماعی عمل کے بغیر ممکن نہیں۔ کسی معاشرے میں اگر خیر غالب ہے تو انفرادی یا جزوی بگاڑ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اگرچہ اس کے پھیلنے

کے امکانات رہتے ہیں۔اس طرح اگر معاشرے میں شر غالب ہے تو جزوی نیکی اور انفرادی خیر کوئی تبدیلی نہیں لا سکتا۔"(۲۳)

ساٹھ کی دہائی کے بعد جدید ٹیکنالوجی کا دور آتا ہے۔ ٹیکنالوجی کی اہمیت اور اس کی افادیت سے کوئی باشعور شخص انکار نہیں کر سکتا اور نہ انسانی زندگی کا کوئی ایسا شعبہ موجود ہے جو جدید ٹیکنالوجی سے خالی ہے۔ارشد محمود لکھتے ہیں:

"مادی ترقی اور ثقافتی ارتقاء باہمی طور پر ایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں۔اگر ہم مادی ترقی کے خواہش مند ہیں تو نئی اقدار کا جنم لازمی تقاضا ہے۔یہ تاریخی عمل کے خلاف ہے کہ ہم جدید صنعتی معاشرے کی خواہش بھی کریں اور فیوڈل قدیم اخلاقی روایات کو بھی لاگو رکھیں۔سائنسی فکر وسعتوں میں نکل جانے اور گہرائیوں میں اتر جانے کا نام ہے۔کنوئیں کے مینڈک سمندروں کے بے کنار وسعتوں سے ہم کنار نہیں ہو سکتے۔"(۲۴)

ٹیکنالوجی کے آغاز کے بعد انسان اس کا اس قدر عادی ہو گیا کہ اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔فطری طور پر انسان ہمیشہ سے اپنے لیے آسانیاں ڈھونڈتا ہے۔انہی آسانیوں کے حوالے سے انسان نے جدید ٹیکنالوجی کا سہارا لیا۔زندگی کے مختلف شعبہ جات میں ٹیکنالوجی نے جیسے زراعت،توانائی،سفر،تجارت اور رابطوں میں نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔زرعی پیداوار کے لیے زرعی مشینری،توانائی کے حصول کے لیے جدید نیوکلیر کا استعمال شروع کر دیا ہے۔زمین سے انسان نے اپنے سفر کا آغاز گھوڑوں سے کیا تھا لیکن اب جدید دور کے اندر ہوائی جہاز، گاڑیوں اور ریل گاڑی پر سفر کر رہا ہے۔سہیل انجم رقمطراز ہیں:

"جدید معاشرے روایتی سماجوں کے مقابلے میں ایک دوسرے سے زیادہ مشابہت رکھتے ہیں۔جدید معاشرے کے مابین روابط کے بڑھنے سے ثقافت خواہ پیدا نہ ہو لیکن اس سے یہ ضرور ہوتا ہے کہ ایجادات اور رواج جس تیزی سے اور جس درجے پر ایک معاشرے سے دوسرے معاشرے میں منتقل ہوتی ہیں وہ روایتی دنیا میں ناممکن تھا۔۔۔ روایتی سماج کی بنیاد زراعت تھی۔جدید سماج کی بنیاد صنعت ہے جس کا ارتقاء دستکاری سے ترقی کر کے کلاسیکی بھاری صنعت اور اس کے بعد علم کی بنیاد پر قائم صنعت کی صورت میں ہو سکتا ہے۔"(۲۵)

جدید دور کے انٹرنیٹ نے برقی پیغامات کو ای میل کے ذریعے اپنے پیغامات کو دوسروں تک آسانی

سے منتقل کیا ہے۔ ٹیکنالوجی ہی کی وجہ سے انسانوں کے درمیان دوریاں بھی ختم ہو چکی ہیں۔ انسان دنیا میں کہیں بھی بیٹھا ہو وہ کسی بھی عزیز سے بات چیت کر سکتا ہے۔ ٹیکنالوجی نے جہاں دوریوں اور فاصلوں کو ختم کیا ہے وہیں انسانی رابطوں کو بھی بہت سہل بنا دیا ہے۔

جدید معاشرے کے فرد کے مسائل:

جدید معاشرہ کا تعلق جدیدیت سے ہے۔ جدید معاشرہ اور فرد کے مسائل کو سمجھنے سے قبل ضروری ہے کہ جدیدیت اور جدیدیت سے متعلقہ اہم امور کا جائزہ لیا جائے تا کہ جدید معاشرہ اور جدید معاشرے میں فرد کے مسائل کو سمجھنا آسان ہو۔

جدیدیت جدت سے ہے۔ جس کا مطلب ہے نیا پن۔ اس کے لیے انگریزی میں لفظ ماڈرن ازم ہے۔ جس کا مطلب ہے پہلے سے الگ اور نیا۔ ابو الاعجاز صدیقی رقمطراز ہیں:

> "تازگی، جدت اور ندرت تنقیدی زبان میں مترادفات ہیں۔ تازگی، جدت اور ندرت کی دو مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں
>
> (الف) بیان، اسلوب یا پیرایہ اظہار کی جدت
>
> (ب) مضمون و معنی کی جدت "(۲۶)

جدیدیت جدت سے نکلا ہے۔ اس سے نیا پن مراد لیا جاتا ہے۔ اس میں تازگی اور نیا پن ہونا ناگزیر ہے۔ اس کی صورتوں میں معنی و مضمون کی جدت اور بیان، اسلوب پیرایہ اظہار اس کی صورتیں ہیں۔ اس طرح جدیدیت سے مراد روایت سے ہٹ کر نئے پن کی موجودگی کا ہونا ہے۔

جدیدیت کا لفظ جس قدر زیادہ وزن رکھتا ہے اسی حساب سے اس کے معنی میں بھی وسعت ملتی ہے۔ اس اصطلاح کو ادبی تحریک، تخلیقی رجحان اور تنقیدی رجحان کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ جدید ایک جامع مبہم اصطلاح کے طور پر مشہور ہے۔ بطور تحریک اگر دیکھا جائے تو اس کا آغاز بیسویں صدی عیسوی میں ہوتا ہے۔ اس کا آغاز یورپ اور دیگر براعظموں کے درمیان ہوا جو وہاں سے ہوتی ہوئی مختلف ممالک کے درمیان بالخصوص بیسویں صدی میں مروج ہوئی۔ اردو میں جدیدیت ۱۹۵۷ء کے بعد اپنا تار پور تیار کرنے لگی۔ بہت سارے معتبر اور مستند ادیب اس سے متاثر ہوئے۔ اردو میں جدیدیت مغرب کی جدیدیت سے کہیں فکری طور پر متصادم کے روپ میں سامنے آئی اور کہیں مفاہمت پر آمادہ دکھائی دی۔

اردو میں جدیدیت کے آغاز وارتقاء کے حوالے سے ڈاکٹر الطاف انجم رقمطراز ہیں:

"اردو میں جدیدیت ۱۹۵۷ء کے بعد اپنا تار پور تیار کرنے لگی۔ فکری اور فلسفیانہ رحجان کی حیثیت سے ادبی منظرنامے پر ابھرتے ہی معتبر اور مستند ادیب اسکی فکری یلغار سے متاثر ہونے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک قافلہ تیار ہو گیا۔ اردو میں جدیدیت مغرب کی جدیدیت سے فکری طور پر متصادم بھی ہے۔ لیکن کہیں کہیں مفاہمت کرنے پر آمادہ بھی دکھائی دے رہی ہے۔ کیونکہ اردو میں جدیدیت ترقی پسند کی ضد کے طور پر سامنے آئی۔ جبکہ مغرب کی جدیدیت میں ترقی پسندانہ رویہ ایک اہم عنصر تھا۔ اس لیے یہ گمان غالب ہے کہ دنیا میں جدیدیت روشن خیالی کا حصہ تھی۔ اور ترقی پسندی اس کا جوہر تھا۔" (۲۷)

جدیدیت اور جدت کے حوالے سے اگر دیکھا جائے تو عموماً ان دونوں کو ایک ہی سمجھا جاتا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو جدیدیت کا فروعی مفہوم جدت کو تصور کیا جاتا ہے۔ جدیدیت کے فکری اور ذہنی محرکات کے حوالے سے ڈاکٹر الطاف انجم لکھتے ہیں:

"اردو میں ۱۹۵۷ء کو جدیدیت کا سال تصور کیا جاتا ہے۔ جدیدیت کے اس فکری اور ذہنی رحجان کو دو اہم محرکات میسر ہوئے جنھوں نے اس کو منظم اور منضبط کر دیا۔ ایک سارتر اور کرکے گارڈ کا وجودی فلسفہ جو اس وقت تک اردو والوں کے لیے اہم موضوع بن گیا تھا۔ دوسرے برصغیر کے سیاسی اور معاشرتی حالات کی ابتری، جنھوں نے عام انسان بشمول ادیب و فنکار کو ذات کی اتھاہ گہرائیوں میں پناہ گزیں ہونے کے لیے مجبور کر دیا تھا۔ یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ ادیب و فنکار خارجی دنیا کی بگڑتی صورتحال سے عملی طور پر دست وگریباں تھے۔ اس کی ذہنی اور فکری اساس کرکے گارڈ اور سارتر کے افکار و تصورات نے فراہم کی۔ جس سے جدیدیت کا رحجان ایک مادی فکری رحجان میں متشکل ہو گیا۔" (۲۸)

جدیدیت کیا ہے؟ اس کی داغ بیل اوراس کے آغاز کے حوالے دیکھاجائے تو اس کا آغاز مغرب سے ملتا ہے۔ مغرب میں سولہویں صدی میں اگر غور کیا جائے تو اس دور کے اندر تہذیبی انقلاب کی روشنی ملتی ہے۔ اس تہذیبی انقلاب کو ہی جدیدیت کا آغاز کہا جائے تو بجا نہ ہو گا۔ اور اس خصوصیت کی وجہ سے اس کو نشاۃ ثانیہ کا نام دیا گیا کیونکہ اس دور کے اندر روایت سے ہٹ کر نئے اور منفرد انداز کو اپنایا جانے لگا۔ قدامت

پسندی کے بر عکس کچھ ایسی اقدار اور اصولوں کو اپنایا جانے لگا جس نے معاشرے کے اندر انقلاب برپا کر دیا۔ الغرض معاشرتی، سیاسی اور سماجی حوالے سے جزوی اور کلی سطح پر تبدیلیاں آنا شروع ہو گئیں۔ اس طرح بہت سارے مروج طریقوں میں تبدیلی آنا شروع ہو گئی۔ اس وجہ سے اس کو نشاتہ ثانیہ کے نام سے پکارا جانے لگا۔

ڈاکٹر عمر فاروق رقمطراز ہیں:

"فرانسیسی لفظ Re بمعنی دوبارہ naissance+ بمعنی پیدا ہونے سے مرکب ہے۔ کلاسیکل نمونوں کے زیر اثر چودھویں اور سولہویں صدی میں علوم و فنون کا احیاء عہد وسطی کے بعد یورپ میں نشاتہ الثانیہ Renaissance (جسے فرانسیسی مورخ مشلے نے احیاء کے معنی میں یہ اصطلاحی نام دیا ہے) کا آغاز ہوتا ہے۔ جو تقریباً دو صدی پر محیط ہے۔ نشاتہ الثانیہ کا آغاز تو اٹلی سے ہوتا ہے۔ لیکن بڑی سرعت سے پورے مغرب میں چھا جاتا ہے ۱۴۵۳ء میں قسطنطینہ پر ترکوں کا تسلط قائم ہونے پر یونانی دانش ور اٹلی میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے اور پھر وہاں سے انا فانا یورپ کے مختلف ملکوں میں پھیل گئے۔ انہی کے علم و فن اور ذہانت نے یورپ کو ایک نئی آگاہی سے مستفید کیا۔ کلاسیکی فنون لطیفہ سے غیر معمولی دلچسپی پیدا ہوئی۔ یونان، روم اور اٹلی کے قدیم علوم و فنون اور آثار قدیمہ کی طرف تحقیق کا رجحان پیدا ہوا۔ اس بیداری کو نشاتہ الثانیہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔"(۲۹)

نشاۃ الثانیہ کو دور جدید کے عبوری زمانے کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اس اصطلاح کو ایک تاریخی دور چودھویں سے سولہویں صدی کے حوالے سے جانا جاتا ہے۔ اس طرح دوسری طرف اٹلی میں ثقافتی اور علمی تحریکوں کے آغاز کو بھی اس سے جوڑا جاتا ہے۔ جہاں نشاۃ الثانیہ پندرہویں اور سولہویں صدی میں تیزی سے پھیلی۔ اٹلی میں عروج کے بعد اس نے فرانس، ہالینڈ، جرمنی اور باقی یورپ ممالک سے ہوتی ہوئی ہندوستان کو بھی اپنے دامن سے لپیٹ لیا۔ اس دور میں جدید ذہن کی تشکیل کے ساتھ ساتھ فنون لطیفہ اور فن تعمیر کے اندر بھی تبدیلیاں آئیں۔

اس طرح مغرب کی صنعتی ترقی نے انسان کو یہ باور کروایا کہ ہر چیز انسان کی ملکیت ہے وہ جو چاہتا ہے وہ پا سکتا ہے۔ دنیا کی ہر چیز کو وہ اپنی عقل کی بنا پر اور اپنی عقل سے حاصل کی ہوئی دولت کے بل پر خرید سکتا

ہے۔ڈاکٹر عمر فاروق لکھتے ہیں:

"سائنسی ترقی نے نئی صارفیت کو جنم دیا اور کاروباری ابلاغیات اور بازکاری نے فرد کو دکان دار اور گاہک میں تبدیل کر دیا۔صارفیت پسندی کے بڑھتے ہوئے رجحان نے جنگ عظیم دوم سے زیادہ پریشان کن مسائل پیدا کیے۔"(۳۰)

جدیدیت کے ارتقاء کے حوالے سے دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے جدیدیت کے ساتھ وہ انصاف نہیں ہوا جس کی اس سے توقع کی جارہی تھی۔لوگوں میں اکثریت جدیدیت کو مغرب کی پیداوار سمجھ کر آج بھی پرانے تصورات کے حامی ہیں۔اس بنیاد پر وہ اپنی تہذیب اور روایت سے منہ موڑ رہے ہیں اور ان کو قدیم سمجھ کر ان سے کنارہ کشی کرتے ہوئے دیکھے جارہے ہیں۔ان کو اپنی شناخت اور تشخص سے دوری کا سامنا کرنا پڑھ رہا ہے۔ساتھ ساتھ اپنی اقدار سے دور ہوتے جارہے ہیں۔اس طرح چند ایسے لوگ ضرور موجود ہیں جو جدیدیت کے معنی مفہوم سے آشنا ہیں۔موجودہ زمانے میں ان تبدیلیوں کو قبول کرتے ہیں۔یہ آزادی اظہار اور آزادی خیال میں اعتدال کے حوالے سے اپنا موقف رکھتے ہیں۔اس طرح اعتدال اور توازن کے برعکس ایک سماجی اور اخلاقی قدر کو پست پشت ڈالنے والا بھی ایک طبقہ پایا جاتا ہے اس طبقے نے اپنی وجودیت کا احساس دلانے کے لیے اپنے قدر کو نمایاں کیا۔اس طرح سماجی اور اخلاقی قدر سے روگردانی کرتے نظر آئے۔اس وجہ سے اگر دیکھا جائے تو قدامت پسند لوگ نقطہ چینی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔موجودہ دور میں صنعت نے اس قدر ترقی کر لی ہے کہ لوگ اس ترقی سے متاثر ہوتے نظر آتے ہیں۔اس صنعتی ترقی نے لوگوں کو نیا شعور دیا۔اس صنعتی ترقی کی بدولت رہن سہن،رہائش،لباس،طور طریقوں الغرض زندگی کے ہر شعبے میں جدیدیت کی طرف لوگ راغب ہوئے ہیں۔صنعتی ترقی اور فیشن کے خاص پہلو سے لوگ متاثر نظر آتے ہیں۔ظاہری شان وشوکت کی طرف لوگ راغب ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔جدیدیت اور صنعتی انقلاب ہی کی بدولت لوگوں میں نیا پن آیا ہے۔اس کو Moderity کہا جائے تو بے جا ہو گا۔جدیدیت کے لیے Moderity کی اصطلاح زیادہ موزوں ہو گئی۔

آل احمد سرور رقمطراز ہیں:

"جدت پرستی میں جدیدیت کے علاوہ موجودہ دور کے صنعتی دور کے صنعتی کمالات یا فیشن کے خاص پہلوؤں کی پرستیش کا پہلو بھی ہے۔جو ظاہر ہے جدیدیت کی روح کو کم اور اس کی ظاہری شان وشوکت یا مقبول قدروں کو زیادہ عزیز رکھتا ہے۔"(۳۱)

انیسویں صدی عقلیت پسندی سے جڑی نظر آتی ہے۔اس دور میں ہر چیز کو ہی عقل کی بنیاد پر دیکھا جانے لگا۔اس وجہ سے اجتماعی طرز احساس پیدا ہونا شروع ہو گیا۔اس دور کے اندر جب عقل کا پیمانہ عام ہونا شروع ہوا تو اس صدی کے آخر میں ان تحریروں کی بدولت رد عقل کا شعور سامنے آنا شروع ہو گیا اور یہ سوچ آہستہ آہستہ ایک تحریک کی شکل اختیار کر گئی۔ بیسویں صدی کو رد عقل کی صدی کے طور پر جانا جانے لگا۔اس میں یہ شعور سامنے آنا شروع ہو گیا کہ بے عقلی کی موجودگی کائنات میں ایک ناگزیر عنصر ہے۔ذہن کا زیادہ تر حصّہ شعور کی بجائے لاشعور کا درجہ رکھتا ہے۔عالمی سطح پر جدیدیت نے براہ راست اثرات لیے ہیں۔عالمی سطح پر جدیدیت نے بہت سی تبدیلیاں پیدا کیں۔ بیسویں صدی میں جدیدیت کی وجہ سے بہت ساری تبدیلیاں رونما ہوئیں۔جس نے ہر شعبہ زندگی پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ڈاکٹر شفیق انجم یوں لکھتے ہیں:

"جدیدیت کے حوالے سے عالمی سطح پر رونما ہونے والی تبدیلیوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔قیام پاکستان کے بعد ۱۹۷۰ء تک کا عرصہ عالمی سیاست و معیشت، فکر و فلسفہ اور سائنس و ٹیکنالوجی کے اعتبار سے خاصا ہنگامہ خیز تھا۔ بیسویں صدی کے نصف اول میں تمام تر نئے پن کے باوجود قدیم طرز احساس کا حوالہ برحال موجود رہا۔ ہر شعبہ زندگی میں ماضی کی طرف جھکاؤ اور اعتقادات وروایات کی پاسداری کو اہمیت دی جاتی رہی۔"(۳۲)

جدیدیت اپنی روایات سے انکار کا نام نہیں۔جدیدیت اپنی تاریخ کی نفی بھی نہیں کرتی۔جدیدیت فن اور مہارتوں میں اپنی روایات کی بجائے خیالات وافکار سے منسلک ہے۔جدیدیت اپنے دور، عہد کے شعور اور مجموعی ادبی ولسانی ارتقاء سے جڑتی نظر آتی ہے۔اس طرح ہر دور کے ادیب جن کے فن پاروں میں دونوں عناصر کی جھلک ہو وہ اپنے عہد میں جدید ہوتے ہیں۔جدیدیت میں فرد اور سماج کے رشتوں کی داستان موجود ہے۔اس میں جہاں فرد کی عظمت کی جھلک موجود ہے وہاں اس کی صورت آئیڈلوجی سے بیزاری، تنہائی اور دیگر پہلو بھی نظر آتے ہیں۔جدیدیت اس حوالے سے بھرپور عکاسی کرتی ہے۔اس حوالے سے پرفیسر آل احمد سرور لکھتے ہیں:

"جدیدیت صرف انسان کی تنہائی، مایوسی اور اس کے اعصاب کی زندگی کی داستان نہیں ہے۔اس میں انسان کی عظمت کے ترانے ہیں۔اس میں فرداور سماج کے رشتے کے

بیان کو خوبی سے بیان کیا گیا ہے۔اس میں انسان دوستی کا جذبہ بھی ہے۔ مگر جدیدیت کا نمایاں روپ آئیڈلوجی سے بیزاری، فرد پر توجہ،اس کی نفسیات کی تحقیق، ذات کے عرفان، اس کی تنہائی اور اس کی موت کے تصور سے خاصی دلچسپی ہے۔اس کے لیے شعر وادب کی پرانی روایت کو بدلنا پڑا۔اور اس کے اظہار کے لیے اسے علامتوں کا زیادہ سہارا لینا پڑا۔"(۳۳)

جدیدیت کے حوالے سے اردو ناقدین کی آراء کو کچھ اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ اس سے ان کی آرا واضح طور پر ہمارے سامنے آتی ہیں۔

ا۔ آزادی اظہار کے لحاظ سے ہر فرد آزاد ہے۔وہ ہر اس چیز کو بیان کرنے کے حوالے سے آزاد ہے جس کی احساس فکری آزادی پر منحصر ہوتی ہے۔اس میں اہم بات یہ ہے کہ فرد کسی ایجنڈے یا نظریے سے بالاتر ہو کر رائے دیتا ہے۔ اس حوالے سے وہ مکمل آزاد ہے۔ڈاکٹر احمد سہیل لکھتے ہیں:" جدیدیت ادب کی ایک ایسی تحریک ہے جو پرانے وکٹورین معیارات کو رد کرتی ہے۔"(۳۴)

۲۔اس حوالے سے دوسرا موقف یہ ہے کہ ادب کی پہچان اظہار ذات کی صورت میں بھی ممکن ہے۔ایک اچھا ادیب وہی ہوتا ہے جو سچائیوں اور حقیقتوں کو سامنے رکھتا ہے، اس کو سامنے رکھ کر اظہار کرتا ہے اور اس چیز کو واضح طور پر بیان کرتا ہے جس قسم کی اس سے توقع کی جارہی ہوتی ہے۔ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے جدیدیت کی شقوں کا ذکر کیا ہے اور ان کا کہنا ہے کہ یہ چار شقیں یا تو رد ہو چکی ہیں یا ان کا ارتفاع ہو چکا ہے۔ان میں سے کوئی بھی شق اپنی اصل یا سادہ شکل میں اب قابل قبول نہیں ہیں۔وہ چار شق یہ ہیں:

> " اول یہ کہ فنکار کو اظہار کی پوری آزادی ہے۔دوسرے یہ کہ ادب اظہار ذات ہے۔ تیسرے یہ کہ فن کی تعین قدر فنی لوازمات پر ہے۔اور چوتھے یہ کہ فن پارہ خود مختار و خود کفیل ہے۔"(۳۵)

۳۔اگر ہم اردو ناقدین کی رائے کو ایک جملے میں لکھنا چاہیں تو ہم مختصر یہ کہتے ہیں کہ ادب، سماجی قدر یا آئیڈلوجی سے بالاتر ہو کر بات کرتا ہے۔

جدیدیت کی صورتیں (ناصر عباس نئیر کے مطابق):

جدیدیت کی پہچان اگرچہ جدت ہے۔ اس جدت کا مطلب محض نیا پن تصور کیا جاتا ہے۔تاہم جدیدیت کی تین صورتیں سامنے آتی ہیں جیسے

۱۔ ہمہ گیر جدیدیت Modernity

۲۔ جمالیاتی جدیدیت Modernism

۳۔ تجدید کاری Moderinization

جدیدیت نئے پن کا نام ہے۔ اس میں ہمہ گیر جدیدیت یا ماڈرنیٹی اس کی ایک صورت ہے۔ اس میں مغرب میں اصلاحی و علمی تبدیلیوں کے بڑے اثرات ہیں۔ ان اثرات اور تبدیلیوں کو ہمہ گیر جدیدیت اور ماڈرنیٹی کے حوالے سے جانا جاتا ہے۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیئر اس حوالے سے لکھتے ہیں: "نشاۃ ثانیہ کے بعد مغرب میں سماجی اور علمی سطح پر اصلاح و تبدیلی کا جو بے مثال عمل ہوا، اسے ماہر بشریات ماڈرنیٹی کا نام دیتے ہیں۔"(۳۶)

نشاۃ ثانیہ کے بعد دیکھا جائے تو مغرب میں کافی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ سماجی اور علمی حوالے سے انقلاب آیا ہے۔ اس سے لوگوں کا رجحان جدیدیت کی طرف ہوا جسے ہمہ گیر جدیدیت یا ماڈرنیٹی کہا جاتا ہے۔ ماڈرنیٹی یا ہمہ گیر جدیدیت کو دیکھا جائے تو یہ جمالیاتی جدیدیت یا ماڈرنزم کی بنیاد بھی ہے اور اس سے قدیم بھی ہے۔ اس طرح اس بنیاد کی وجہ سے اس کی اپنی اہمیت ہے۔ اس طرح ماڈرنیٹی اور ماڈرنزم کے حوالے سے ڈاکٹر ناصر عباس نیئر لکھتے ہیں:

> "ماڈرنیٹی، ماڈرنزم کی بنیاد اور اس سے قدیم ہے۔ دوسرے لفظوں میں تخلیقی و جمالیاتی رویے ایک ہمہ گیر فلسفیانہ، سیاسی اور اخلاقی فریم ورک سے پھوٹتے ہیں۔ یا تخلیق کار پر مضامین (واسالیب) غیب سے ہی اترتے ہیں۔ مگر یہ غیب عدم کے مترادف نہیں بلکہ وہ فکری اور معاشرتی فضا ہے۔ جو ایک عہد میں غالب ہوتی ہے۔"(۳۷)

ماڈرنیٹی ماڈرنزم کی بنیاد تصور کی جاتی ہے۔ اس ہی بنیاد کی وجہ سے فکری اور معاشرتی شعور کو پروان چڑھنے کا موقع ملتا ہے اور اس کا اثر ایک عہد پر دیکھا جا سکتا ہے۔ تجرید کاری یا ماڈرنزیشن میں جدید سماج سے رونما ہونے والی تبدیلیوں کو مد نظر رکھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیئر لکھتے ہیں: "تجرید کاری یا ماڈرنائزیشن کا تعلق جدید صنعتی سماج میں رونما ہونے والی معاشرتی تبدیلیوں سے ہے۔"(۳۸)

جدید صنعتی سماج کی وجہ سے معاشرے کے اندر صنعتی انقلاب کے اثرات دکھائی دیے گئے۔ اس مشینی دور کی وجہ سے زندگی کے ہر شعبے پر اثرات پڑے۔ اس سے سماجی اور معاشرتی سطح پر بھی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اس ہی کو تجرید کاری یا ماڈرنائزیشن کہا جاتا ہے۔

ہر زمانے کے اندر ایک فکر موجود ہوتی ہے۔ اگر وہ فکر اپنے عہد کے تقاضوں کے مطابق ہو اور اس

کے ساتھ ساتھ اس میں آگے بڑھنے اور تبدیلی کا عنصر بھی موجود ہو تو وہ جدیدیت کے دائرہ کار میں آتی ہے۔

۱۹۶۰ء کے بعد جس تحریک نے ادب پر اثرات مرتب کیے اس تحریک کو جدیدیت کی تحریک کے نام سے جانا جاتا ہے۔یہ تحریک ترقی پسند تحریک کے ردعمل کے طور پر سامنے آئی۔جدیدیت اپنے عہد کی حساسیت کو احسن انداز میں سامنے لاتی ہے۔جدیدیت سے قبل ترقی پسندی کا دور تھا۔ترقی پسند تحریک ادبی ترقی سے زیادہ معاشی و معاشرتی افکار پر منحصر تھی۔اس لیے اس تحریک کے تحت تخلیق ہونے والے ادب کو معاشرتی ترقی کے عناصر کی موجودگی کی بنیاد پر پرکھا جانے لگا۔اس سے ادب کا دائرہ محدود ہونے لگا اور شعر و ادب گھٹن محسوس کرنے لگ گئے تھے۔جدیدیت نے ہر زمانے کے اندر نیا روپ اختیار کیا۔ہر زمانے کے تہذیبی اور تخلیقی تقاضوں کے زیر اثر جدیدیت جب سامنے آئی تو یہ آزادی، نئے پن اور اجتہاد کی طرف راغب نظر آئی۔یہ نئے قالب میں ڈھلتی دکھائی دی، اس لیے اس بدولت اس نے پرانے اور مروجہ رسم ورواج کو بالا طاق رکھتے ہوئے جدت اور نئے پن کو اپنایا اور اس کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لیا۔پروفیسر فتح محمد ملک اس حوالے سے رقمطراز ہیں:

> "جدیدیت ایک ایسا رجحان ہے جو ہر زمانے کے تہذیبی اور تخلیقی تقاضوں کے زیر اثر نئے روپ میں ظاہر ہوتا ہے۔نت نئے قالب میں ڈھلتی جدیدیت کی اساس اس نئے تجربے کی پکار پر بیک کہنے کے جذبے اور بزرگوں کی سند اور مروجہ رسوم وقیود کو حتمی سمجھنے کی بجائے آزادی اور اجتہاد کی روش اپنانے میں پوشیدہ ہے۔"[۳۹]

ترقی پسند تحریک کی رو میں حلقہ ارباب ذوق جیسی ادبی تنظیم بھی سامنے آئی۔تاہم یہ تنظیم اس سطح پر لامحدود جائزوں کی حامل نہیں تھی۔دوسری جنگ عظیم نے بھی ادباء اور تخلیق کاروں کے مزاجوں کو بدل کر رکھ دیا۔اس طرح برصغیر کی تقسیم کی صورت میں بھی ترقی پسند تحریک جمود کا شکار نظر آتی ہے۔ایسے میں جمود کو توڑنے کی ضرورت ادب میں محسوس ہونے لگی۔اس مقصد کو سامنے رکھ کر جدیدیت کی تحریک کا آغاز ہوا۔اس طرح ترقی پسند تحریک کے بعد اور بھی بہت ساری تحریکیں آئیں جو عمل اور ردعمل کا نتیجہ تھیں۔ ڈاکٹر عصمت جمیل رقمطراز ہیں:

> "ترقی پسند تحریک کے بعد اور بہت سی تحریکیں ابھریں۔ان تحریکوں کا مطالعہ کرتے جائیں تو صرف ایک بات سمجھ آتی ہے کہ یہ تحریکیں عمل اور ردعمل کا نتیجہ تھیں۔ریئلزم اور نیچرل ازم کی کھردری حقیقت پسندی کے خلاف۔۔۔کی تحریکیں

سامنے آئیں۔ جنھوں نے انسان کی انفرادیت اور احساسات کا بول بالا کیا۔"(۴۰)

جدیدیت کا موقف یہ تھا کہ ادب کسی خاص فکر اور نقطہ نظر سے بالاتر ہو۔ ادیب اپنی تخلیق کو کسی خاص نقطہ نظر تک محدود نہ رکھے۔ جدیدیت فکری آزادی کا نام ہے۔ اس کا تعلق انسان کے باطن سے جڑا ہوا ہے۔ جدیدیت ظاہری مظاہر کے برعکس باطنی مظاہر کی عکاسی کرتے ہوئے دکھائی دیتی ہے۔ جدیدیت میں اجتماع کی جگہ انفرادیت کو دیکھا جاتا ہے۔ یہ انفرادیت فرد کی ذات سے جڑی ہے۔ جس میں ذاتی طور پر فرد کو دیکھا جاتا ہے۔ اس نے انسان کے باطن کی طرف توجہ دلوائی ہے۔ اس میں تنہائی، انفرادیت، فردیت، اظہار ذات اور داخلیت جیسے رجحانات نظر آنے لگے۔ اور ان کا اظہار مختلف صورتوں میں نظر آنے لگا۔ اس حوالے سے اہم خالد فیاض لکھتے ہیں:

> "جدیدیت میں سائنسی زندگی سے بے زاری ،لاشعوری محرکات ،اجتماعی لاشعور کی کارفرمائی، لایعنیت، اجنبیت، مایوسی۔۔۔اور عرفان ذات جیسے عناصر غالب حیثیت اختیار کر گئے۔ اور ان کے رجحانات کے اظہار کے لیے مختلف اسالیب برتے گئے مثلا شعور کی رو، تلازمہ خیال، اظہاریت، پیکریت، علاقیت، تجریدیت، ارسطویت، ماڈرن ازم وغیرہ۔"(۴۱)

جدیدیت کی تحریک کے آغاز کے حوالے سے مختلف لوگوں کی مختلف رائے ہیں۔ بعض کے نزدیک جدیدیت کے آغاز میں پریم چند کی زیر صدارت اردو کی پہلی کانفرس کارفرما ہے۔ اور بعض نے علی گڑھ کی تحریک کے ساتھ جدیدیت کو منسوب کیا ہے۔ روایت شکنی کے برعکس جدت کا تصور سامنے آتا ہے۔ روایت شکنی پہلے سے موجود چیزوں کے برخلاف عملی اقدامات کا نام ہے۔ جدیدیت کی تحریک اور ترقی پسند تحریک میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ ترقی پسند تحریک باقاعدگی سے تنظیم کے تحت کام کر رہی تھی جبکہ جدیدیت کے سامنے کسی طرح کی تنظیم سازی نہیں تھی۔ جدیدیت ایک حرکت اور تفسیر کا نام ہے۔

ڈاکٹر محمد اشرف کمال لکھتے ہیں:

> "جدیدیت دراصل حرکت کا نام ہے۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ آگے کی طرف حرکت۔ جدیدیت سکوت، ٹھہراؤ اور روایت سے نبرد آزما ہوتے ہوئے آگے بڑھتی ہے۔ اس کے نتیجے چونکانے کی کیفیات سے مالامال ہوتے ہیں۔"(۴۲)

جدیدیت کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ ظاہر کے برعکس باطن کو ترجیح دیتی ہے۔ اس سے قبل یہ

دیکھا جاتا تھا کہ لوگوں کی پسند اور سوچ کیا ہے اور وہ کس چیز کی طلب رکھتے ہیں۔ جدیدیت نے سوچنے کے حوالے سے بات کی ہے۔ فرد کی انفرادی سوچ اور جذبات کی عکاسی کی ہے۔ معاشرتی ترقی کا راز جدیدیت سے جڑا ہوا ہے۔ جدیدیت یہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں نئے رجحانات اور میلانات کو اپنایا جائے۔ وقت کے نئے تقاضوں کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالا جائے۔ ڈاکٹر ندیم احمد لکھتے ہیں:

> "اپنے عہد کی زندگی کا سامنا کرنے اسے تمام خطرات وامکانات کے ساتھ برتنے کا نام ہے۔ ہر عہد میں جدیدیت ہم عصر زندگی کو سمجھنے اور برتنے کے مسلسل عمل سے عبارت ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے جدیدیت ایک مستقل عمل ہے جو ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ ہر عہد میں ان لوگوں نے جو حقیقی طور پر زندہ رہے ہیں اس عمل میں حصّہ لیا ہے۔ انھوں نے فکر وفن کی سطح پر فرسودہ اقدار کے خلاف جنگ کر کے نئی قدروں کی پرورش اور عمل زندگی کو نئے سانچوں میں ڈھالا ہے۔"(۴۳)

جدیدیت کی یہ خوبی ہے کہ اس میں خارجی آب و رنگ کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ خارجی حوالے سے بھرپور ترجمانی ملتی ہے۔ اس طرح جدیدیت وقت کی تقسیم کے رسمی تصور کا پابند نہیں بلکہ اس سے بالاتر ایک تازہ کار ذہنی رویہ ہے۔ شمیم حنفی لکھتے ہیں:

> "جدیدیت سری اور ماورائی حقائق کی اہمیت سے ارضی رشتوں کے اثبات کے باوجود انکار نہیں کرتی اور پوری انسانی صورتحال یا پورے آدمی کو اپنا موضوع بناتی ہے۔۔۔ ایک ازلی اور ابدی الجھن میں مبتلا ہے کہ اپنی حقیقت کا اصل سرا کہاں ڈھونڈے۔"(۴۴)

جدیدیت دلیری کے ساتھ زندگی کا سامنا کرنے اور اس کو تمام خطرات اور امکانات کے ساتھ نبھانے کی تصویر ہے۔ جدیدیت ڈر اور خوف دور کر کے معاشرے میں افراد کے اندر خوداعتمادی کو فروغ دینے کا سبب ہے۔ جدیدیت ویسے تو ہر زمانے کے اندر کسی نہ کسی شکل میں ہوتی ہے مگر ایک زمانے کی جدیدیت دوسرے زمانے کی جدیدیت سے منفرد ہوتی ہے۔

جدیدیت کو فروغ دینے میں جہاں دیگر عناصر کا کردار ہے اس کے ساتھ ساتھ سائنس نے اس تصور کو کافی فروغ دیا۔ سائنسی ترقی کی وجہ سے بہت سے نظریات تبدیل ہو گئے ہیں۔ بہت سے نئے تصورات نے مروج نظریات اور تصورات کی جگہ لے لی ہے۔ سائنسی ترقی نے ان ذہنوں کو تبدیل کرنے میں اہم کردار ادا

کیا جو جدیدیت کی حامل سوچ کے مالک تھے۔

سائنسی ترقی اور جدیدیت نے مذہبی سطح پر بھی اثر ڈالا۔ مذہبی اقدار کو تبدیل کر کے رکھ دیا۔ ہماری بہت سی اخلاقی اور مذہبی اقدار جو ہمارے مذہب نے ہمیں دی تھیں جدیدیت کی بدولت ان سے روگردانی کی جانے لگی۔ جدیدیت کی بدولت مذہبی تصورات تبدیل کرنے کی کوشش کی گئی۔ مذہبی تصورات جن کی تفہیم لوگوں کے لیے مشکل تھی ان کو بنیاد بنا کر مذہب کے حوالے سے نت نئے نظریات نے جنم لینا شروع کر دیا۔ مذہب کے حوالے سے منفی رویوں کی بازگشت سنائی دی گئی۔ مذہب کے حوالے سے درست طریقوں سے روگردانی کی گئی۔ مذہب کو درست انداز میں پیش نہیں کیا گیا۔ مذہب کے حوالے سے جب اس قسم کے مسائل سامنے آنا شروع ہوئے تو ایسے میں مذہب سے لوگوں نے بے راہ روی اختیار کرنا شروع کر دی۔ قاضی جاوید لکھتے ہیں:

"انسان کی فکری تاریخ کے ابتدائی مراحل میں وجدان یا وحی کو صداقت کی یافت کا واحد ذریعہ قرار دینے کا رحجان غالب تھا۔ آہستہ آہستہ عقل کی اہمیت کو بھی تسلیم کیا جانے لگا۔ لیکن ابھی مذہبی اور عقلی نظریات میں واضح حد امتیاز قائم نہیں کی گئی تھی۔ اکثر و بیشتر عقلی حاصلات کو بھی مذہب والہیات میں گڈ مڈ کر دیا جاتا تھا۔ اس کا سبب مذہب کی سماجی اور سیاسی بالادستی تھی۔ ابن رشد نے اس صورت حال کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے مذہبی و عقلی صداقتوں میں امتیاز پر زور دیا۔ اس کے بعد عقل کی برتری کا عہد شروع ہوا۔"(۴۵)

جدیدیت کو فروغ دینے میں جہاں دیگر عناصر کا کردار ہے وہیں تہذیبی اقدار نے بھی جدیدیت کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ تہذیبی اقدار نے ذہنوں میں تبدیلیاں پیدا کیں۔ جدیدیت کے حامل ذہنوں نے ایک نئی سوچ کو فروغ دیا۔ جدیدیت نے ان فرسودہ رسم و رواج کے خلاف ایک زبردست تخلیقی قوت کا سماں پیدا کیا۔ اس حوالے سے ڈاکٹر تبسم کشمیری لکھتے ہیں:

"جدیدیت اپنے طرز احساس کے حوالے سے ماضی کے وجود سے انکار نہیں کرتی ہے۔ ماضی کی نفی کے بغیر جدیدیت کا کوئی تصور پیدا نہیں ہو سکتا۔ جدیدت کی اساس اس نفی پر ہے جس سے وہ حال سے مثبت رابطے قائم کرتی ہے۔"(۴۶)

جدیدیت نے فرد کی شخصی ترقی کی راہیں ہموار کر دی ہیں۔ اس کی بدولت جہاں فرد نے اس کے مثبت

اثرات سے فائدہ اٹھایا ہے وہیں فرد کے مسائل میں بھی اضافہ ہوا ہے۔اس طرح آسائش کو جب فروغ ملنا شروع ہوا تو اس سے خود پسندی کی فکر نے زور پکڑا جس سے معاشرتی نقصان کی صورت میں مسائل سامنے آنا شروع ہو گئے۔ڈاکٹر ناصر عباس نیئر لکھتے ہیں:

> "جدت، انفرادیت، انحراف اور تجربے کی صرف اس حد تک اجازت دیتی ہے جہاں تک روایت کی پاسداری کو کوئی خطرہ نہ ہو۔ مگر جدیدیت کی نظر میں روایت سے زیادہ اہم وہ صورتحال ہے جو خود فرد کو درپیش ہوتی ہے۔لہذا جدیدیت کی نظر اس صورت حال کا تجربہ اور تجزیہ اولیت رکھتا ہے۔یوں جدیدیت خود کو روایت سے منقطع کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتی۔"(۴۷)

ساٹھ کی دہائی کے بعد جدیدیت کے آنے کے بعد جو منفی اثرات مرتب ہوئے وہ ملکی سطح پر انتظامی امور میں انتشار کا موجب بنے۔انتظامی امور میں اخلاقی ضابطوں اور روایات سے بھی انحراف کیا جانے لگا۔انتظامی امور میں انتشار کی وجہ سے فرقہ بندی، معاشی اور معاشرتی خلفشار کا باعث بنی۔جدیدیت نے جہاں انتظامی امور میں تبدیلیاں رونما کیں وہیں بہت سے منفی اثرات مرتب کرنے کا باعث بنی۔ڈاکٹر اقبال آفاقی لکھتے ہیں:

> "انیسویں صدی کے عقلیت پسندوں نے یہ دعوی زور و شور سے کیا تھا کہ سائنس کے کلیہ اصول اور آفاقی سچائیاں ہی انسان کو کامیابی کے زینوں پر چڑھا سکتی ہیں۔اس طرح سائنس نے نہ صرف اخلاقی اقدار کو پامال کیا بلکہ حرص، ہوس اور خود پرستی کو بھی رواج دیا۔فرد ہر قیمت پر کامیابی حاصل کرنے کے لیے سب کچھ کرتا نظر آیا۔خیر اور شر میں امتیاز تو دور کی بات ہے، اس نے تو مذہب اور اخلاقیات کو بے معنی اور فضول قرار دیا۔خاندانی نظام کو ہی توڑ ڈالا۔اپنے گھروں میں رہ کر اجنبی اور بے گھر ہو گئے۔ہر طرف اشتباہ، دوطرفگی اور مغائرت کو فروغ حاصل ہوا۔جدیدیت کے سارے اخلاقی، نفسیاتی اور جمالیاتی سوالات اسی گھمبیر صورت حال کے گرد گھومتے ہیں۔"(۴۸)

جدیدیت کے رجحان سے پہلے فرد واحد کو اہمیت حاصل تھی۔اجتماعیت کو فروغ حاصل تھا۔معاشرے کے اندر اجتماع کی صورت میں لوگ مل کر کام کرتے تھے۔لیکن جدیدیت کا رجحان غالب آنے کے بعد اجتماعیت کی اہمیت ختم ہو گئی۔جدیدیت کا رجحان کسی ایک نقطے میں سمٹنے کی بجائے حدود کو توڑ کر باہر نکل

گیا۔ جس کی وجہ سے سماج کے اندر محدودیت، یکسانیت اورلایعنیت جیسے مسائل پیدا ہوئے۔نئے ذہن آزادی، خود مختاری اور بغاوت کے رویے کی وجہ سے سماج کے اندر فرد تنہا ہو گیا اور فرد اپنی شناخت کو بھی برقرار نہ رکھ سکا۔ جدیدیت نے جہاں اجتماعیت کی بجائے فرد کو اہمیت دی وہیں اس کے منفی اثرات بھی مرتب ہوئے۔ فرد معاشرے کے اندر اجتماع کے باوجود تنہا ہو گیا۔ بہت سے لوگ اس کے ارد گرد ہونے کے باوجود بھی لایعنیت جیسے مسائل سے دوچار ہوئے۔ جدیدیت نے لایعنیت کو فروغ دیا۔ جس کی وجہ سے معاشرے میں نظریہ پرستی، بغاوت، روایت پسندی اور گہرے کرب جیسے مسائل پیدا ہوئے۔ ڈاکٹر ممتاز احمد لکھتے ہیں:

"کرکیگارڈ اور سارتر کے یہاں یعنی اہم اختلافات کے باوجود زندگی کی رائیگانی کا تصور موجود ہے۔ خود صفحہ زمین پر انسان کا ظہور بے معنی و مضحک ٹھہرتا ہے۔ جذبات کی معنویت سے عاری اس فکر نے ادب میں بھی لایعنیت کے رجحان کو فروغ دیا۔"(۴۹)

وجودیت جدیدیت کے افکار کا نتیجہ ہے۔ انیسویں اور بیسویں صدی کے وسط میں ابھرنے والا ایک مکتبہ فکر ہے۔ یورپ میں عجیب ذہنی کشمکش، مادہ پرستی، افراتفری اور سائنسی ترقی وجودیت کے اہم محرکات ثابت ہوئے۔ ان تمام عوامل نے فرد کو نفسیاتی الجھنوں اور تنہائی کا شکار کر دیا اور فرد کی شناخت چھین لی گئی۔ اقتصادی بحران نے انسان کو ناکامی، بے یقینی، مایوسی اور ہر لحاظ سے بداعتمادی کے دہانے پر لا کھڑا کر دیا۔ وجودیت چونکہ جدیدیت کے افکار کا نتیجہ ہے اس لیے اس کو باقاعدہ طور پر نہیں لکھا گیا۔ بلکہ مرکزیت اور عقلیت کی سرپرستی نے وجودیت کو جنم دیا ہے۔ وجودیت ایک ایسا مذہب ہے جو اس وقت رونما ہوا جب جدیدیت کے زیر اثر نمایاں چیزیں تسکین پہنچانے میں ناکام ہو گئیں۔

وجودیت کا مطلب ہے انسانی ذات کی تلاش کا سفر دو عالمی جنگوں سے ہوتا ہے۔ جنگ میں تنہائی، کرب اور موت جیسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ محرکات وجودیت کی تحریک کا باعث بنتے ہیں۔ وجودیت میں انسان کو اوّل اہمیت دی گئی اور اس کے جوہر کو ثانوی حیثیت دی گئی۔

وجودیت کے حوالے سے شمیم حنفی لکھتے ہیں:

"وجودیت ایک فلسفیانہ میدان کی حیثیت سے صنعتی تہذیب کے انتشار اور تضادات کے نتیجے کے طور پر سامنے آئی۔"(۵۰)

وجودیت فرد کی بے مثل انفرادیت پر اسرار کرتے ہوئے طبعی دنیا کے مقابلے میں انسانی وجود کو بنیادی حیثیت دیتی ہے۔ انسانی عظمت کا احساس اس وقت بیدار ہوتا ہے جب فرد آزاد ہو۔ فرد کی آزادی کی

شرط وجودی مفکرین کے نزدیک ضروری ہے اور تحریک وجودیت میں بھی سب سے پر کشش اور مقبول نعرہ فرد کی آزادی سے مشروط ہو اور یہ مسئلہ آج بھی توجہ طلب مسئلہ ہے۔ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

"وجودیت کی اساس اس امر پر استوار ہے کہ انسان اس دنیا میں آزاد اور منفرد پیدا ہوا۔لیکن معاشرے میں رہنے کی بناپر وہ اپنے لیے ایک خاص نوع کا طرز عمل منتخب کرنے پر مجبور ہے۔بحیثیت ایک فرد یہ انتخاب اس کا حق ہے۔جبکہ معاشرے کا ایک رکن ہونے کی بناپر یہی انتخاب ایک طرح کی مجبوری بن جاتا ہے۔اس سے قرب کا وہ احساس جنم لیتاہے جو جدید انسان کا سب سے بڑاالمیہ ہے۔"(۵۱)

وجودیت کی تحریک اس وقت سامنے آئی جب عقل پرستی اور سائنس پرستی انسانی زندگی کو تسکین دینے اور بہتر طرز زندگی میسر کرنے میں ناکام ہو گئی۔ قاضی جاوید لکھتے ہیں:

"وجودیت ایک نیامذہب ہے جو دیگر مذاہب کی مانند اس وقت ظہور ہوا جب کہ پہلے سے موجود مذاہب۔۔۔جن میں عقل پرستی اور سائنس پرستی بھی شامل ہیں، جنہیں انیسویں صدی میں مقبول عقائد کا مرتبہ حاصل ہوا۔۔۔انسانی روحوں کو تسکین دینے اور ان کے لیے بہتر طرز زندگی کا تعین کرنے میں ناکام ہو گئے۔"(۵۲)

جدیدیت کی وجہ سے افراد کے اندر کھوکھلا پن،مایوسی اور خودکشی جیسے مسائل کا فروغ ہوا۔جدیدیت کے بڑھتے ہوئے رجحان سے پہلے معاشرے کے اندر خودکشی، کھوکھلا پن اور مایوسی جیسے مسائل نہیں تھے۔ معاشرے کے اندر اجتماعیت کا فروغ تھا۔ لیکن جدیدیت نے جہاں بہت سے مثبت اثرات مرتب کیے وہیں بہت سے مسائل بھی پیدا کیے۔سماجی اور معاشی مسائل کی سنگینی میں اضافہ کیا۔اس کا زیادہ تر اثر نوجوانوں پر ہوا۔ تیس سال سے کم نوجوانوں کے اندر اکیلے پن اور خودکشی جیسے رجحانات نے فروغ پایا۔مایوسی،خودکشی کے عوامل میں سے ایک ہے۔جدیدیت کی وجہ سے چونکہ فرد تنہا ہو گیا۔جدیدیت نے اجتماعیت کی بجائے فرد کو اہمیت دی۔ لیکن فرد سماجی اور معاشی مایوسی اور کھوکھلے پن کا شکار ہو گیا۔ آگے بڑھنے کی کوشش نے ہر فرد کے اندر مایوسی،خودکشی اور کھوکھلے پن جیسے رویوں نے جنم لیا۔افراد کے اندر خودکشی کے بارے میں علم اور آگاہی نہیں ہوتی۔ فرد کو اپنے مسائل کا حل خودکشی میں نظر آنے لگا۔ساٹھ کی دہائی کے بعد کا دور جدیدیت کا دور ہے۔یہی وہ دور ہے جہاں اجتماع کے باوجود فرد تنہا ہوا۔ اسی دور کے بعد معاشرے کے اندر بے سکونی، انتشار اور مایوسی جیسے مسائل عام ہو گئے۔

ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

"جدیدیت قدیم اور جدید روایت اور بغاوت مسلمات تجربات اور عمل و رد عمل کی کشمکش کا ثمر ہے۔اور اس لحاظ سے اسے واقعی ایک ہمہ گیر ذہنی انقلاب کا نام دیا جا سکتا ہے۔لیکن اس ذہنی انقلاب کا باعث بننے والے ذہنی اضطراب اور اس سے وابستہ مختلف عوامل و محرکات نظر انداز نہیں کرنا چاہئیے کہ ان ہی سے اہم حقیقت تک سائی ہے۔"(۵۳)

جدیدیت کے دور کے بعد جہاں بہت سے مثبت اثرات مرتب ہوئے وہیں جدیدیت خاندانی نظام میں انتشار کا باعث بنا۔ اس وجہ سے غیر صحت مند اخلاقی اقدار کو فروغ ملا۔انفرادی منافقت آہستہ آہستہ اجتماعی بدنیتی کی شکل اختیار کر گئی جس کی وجہ سے خاندان اور معاشرے کے اندر بگاڑ پیدا ہوا۔ اس وجہ سے سماجی ارتقاء اور اخلاقی رویوں میں خلل پیدا ہوا۔اس خلل کی وجہ سے خاندانی نظام کا توازن کہیں کھو گیا۔ معاشرہ زوال پذیری کی طرف مڑ گیا۔ہندوستانی معاشرے کے اندر غیر آسودگی کا نظام پھیل گیا۔مل جل کر رہنے والا یہ معاشرہ جب انتشار پذیری کا باعث بنا تو ہر ادیب اور شاعر پر براہ راست اثرات مرتب ہوئے جس سے سماج اور معاشرے کے عناصر بدل گئے۔ڈاکٹر شمیمہ بیگم رقمطراز ہیں:

"یقیناً ہمارا ہندوستانی معاشرہ نہایت آسودگی بخش ہے۔اور اس کا احساس نہ صرف ہر ادیب اور شاعر کو ہے بلکہ ہر اس شخص کو ہے جس کے پاس احساس کی دولت ہے۔اس بدیہی بات کا اظہار یا دہرایا جانا کافی نہیں ہے۔اس کا بدل سوچنا اور اسے حاصل کرنے کی جدوجہد کرنا بھی ضروری ہے۔چاہے یہ عمل صرف ذہنی ہی کیوں نہ ہو۔"(۵۴)

جنسی بے راہ روی کا مسئلہ نہ صرف قبائلی لوگوں اور جاہل انسانوں تک محدود ہے بلکہ شہروں میں رہنے والے تعلیم یافتہ لوگوں کے اندر جنسی بے راہ روی کا مسئلہ بہت بڑھ گیا ہے۔یعنی کہ جدیدیت کے دور میں کوئی عورت یا لڑکی محفوظ نہیں ہے۔کہنے کو تو جدیدیت کی وجہ سے بہت زیادہ تبدیلیاں آئی ہیں لیکن اس جدید دور کے بعد جنسی تشدد کا نشانہ بننے والی عورتوں کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے۔

جنسی استحصال کی وجہ سے سماج کے اندر عورتوں کی حالت اور بھی زیادہ نازک کر دی گئی ہے۔طبقہ اعلی میں عورتوں کے لیے بھی کوئی محفوظ پناہ گاہ نہیں ہے۔حالانکہ عورتوں کی اکثریت اپنے حقوق اور اختیارات سے واقف ہے۔لیکن اس جدید دور میں درندوں نے عورتوں کا جینا محال کر دیا ہے۔جدید دور کے

بعد یہ مسئلہ بہت زیادہ ابھر کر سامنے آگیا ہے۔ تعلیم یافتہ لوگوں کے ہاں بھی بنیادی طور ہر کوئی خاص تبدیلیاں نہیں آئیں نہ ہی عورتوں سے متعلق لوگوں کی سوچ بدلی ہے۔ آج بھی لوگ عورت کو اپنی روح کی تسکین کے لیے استعمال کرتے ہیں اور جسمانی ہوس کا نشانہ بنا کر مرنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ڈاکٹر نازیہ یونس رقمطراز ہیں:

> "جاگیر دارانہ اور سرمایہ دارانہ نظاموں کی عمارت استحصال کی بنیادوں پر کھڑی ہوتی ہے۔جہاں مجبور اور بے بس انسانوں کے بنیادی حقوق غصب ہو جاتے ہیں۔ان نظاموں کے پروردہ اذہان سرمائے اور طاقت کے بل بوتے پر ناممکنات کو بھی ممکنات بناتے ہیں۔پر تعیش زندگی اور من مانی جنسی تسکین کی ہوس رکھنے والے مردوں کے ہاں عورت کی وقعت بازار کی جنس سے زیادہ نہیں ہوتی جس کی ہر روز منڈی میں بولی لگتی ہے۔قیمت ادا ہوتی ہے اور نیلام ہوتی ہے۔"(۵۵)

ماحول اور انسان ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔انسان کے لیے اس ماحول کو اللہ تعالیٰ نے متوازن پیدا کیا ہے۔اس کائنات میں انسان کے آنے کے بعد جس چیز سے سب سے پہلے شناسائی ہوئی وہ ماحول ہی تھا۔یہی ماحول انسان کا محافظ تھا۔مگر جوں جوں انسان ترقی کی منازل طے کرتا گیا اور جدیدیت سے پس جدیدیت تک پہنچا تو اس ماحول کو نئے ماحول نے تباہ کر دیا۔وہ ماحول جو انسان کا محافظ تھا آج انسان کی تباہی کا ذمہ دار بن چکا ہے۔آبی وفضائی آلودگی،شور کی آلودگی،گلوبل وارمنگ،اوزون کی تباہی اور شدید موسمی تبدیلیاں نہ صرف انسان کے لیے خطرہ بن چکی ہیں بلکہ اس کرہ ارض کی بقا کے لیے بھی خطرہ بن چکی ہیں۔

ماحولیاتی بحران کا تعلق انسان کے اخلاقی،تعلیمی،معاشرتی اور معاشی زوال کے ساتھ براہ راست جڑا ہوا ہے۔یعنی کے اس جدیدیت کے دور میں انڈسٹری کے قیام کی وجہ سے بے جا درختوں کی کٹائی،دریاوں اور سمندروں کو برباد کرنا،فیکٹریز کا گندہ پانی سمندروں میں پھینکنا،پیدوار میں اضافہ کے لیے کیمیائی ادوایات کا استعمال،انسانی ضروریات پوری کرنے کے لیے پیدوار میں اضافہ ،انسانی خوراک پوری کرنے کے لیے ادوایات کا استعمال ایسے عوامل ہیں جس نے انسان کو اس کے ان اخلاقی اصولوں سے ہٹا دیا جو اس ماحول کے محافظ تھے۔ماحولیاتی آلودگی کی سب سے بڑی وجہ صنعت کاری کا فروغ،جنگلات کا خاتمہ،شہروں کا بہت زیادہ بڑھنا،اجناس کی کمی کو پورا کرنے کے لیے کھادوں،کیڑے مار ادوایات اور سپرے کا استعمال ایک ناگزیر عمل بن گیا۔

بینش فاطمہ رقمطراز ہیں:

"جدیدیت کی اصطلاح نے فکر انسانی کو جولانی بخشی اور لامتناعی تجربات اور مشاہدوں کی آماجگا بنا دیا۔ ایک ایسی ذہنی اور فکری خود مختاری کی طرف اذہان کی پیش رفت وجود میں آنے لگی کہ انسان فکر و فلسفہ کے نئے نئے جہاں تلاش کرنے میں منہمک ہوا۔ اس کے بعد شعور، تحت الشعور اور لاشعور کی دنیائیں بھی نئے تجربات کی کسوٹی پر رکھی گئیں۔ خوابوں اور خواہشوں کے جدید معانی و مفاہیم تلاش ہونے لگے۔"(۵۶)

آلودگی کے بحران کی وجہ سے چڑچڑاپن، ڈپریشن کا موجب بن رہا ہے جو بڑی تبدیلیوں کا پیش خیمہ ہے۔

متحد ترقی یافتہ اور تیسری دنیا کے ممالک بشمول پاکستان اس کیفیت میں مبتلا ہیں کہ ترقی یافتہ اور صنعتی ممالک پر ترقی پذیر ممالک انحصار کرنے لگے۔ یعنی کہ اس دور میں بھی ان ممالک سے زیادہ تر ایسے ملک ہیں جو اپنی تقدیر کا فیصلہ اپنی مرضی سے نہیں کر سکتے۔ خود مختار ہونے کے باوجود بھی دوسروں پر انحصاری ان کے اندر پائی جاتی ہے۔ حالانکہ انہیں آئینی اور قانونی آزادی حاصل ہے۔ اس کے باوجود بھی کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے انہیں دوسرے ممالک سے اجازت لینا پڑتی ہے۔

پاکستان کے اندر اپنا مذہب، اپنا ملک اور اپنی حکومت ہے۔ لیکن بہت سے معاملات کو حل کرنے کے لیے دوسرے ملکوں سے اجازت لینا پڑتی ہے۔ جدیدیت کی وجہ سے جہاں انسانوں کے اندر حوصلہ افزائی جیسی خصوصیت پیدا ہوئی ہے وہیں دوسروں پر انحصار جیسی خامیاں بھی سامنے آئی ہیں۔ دوسروں پر انحصار کی خامی سماج کے اندر زیادہ تر افراد کے اندر پائی جاتی ہے۔ ہر کوئی خود محنت کرنے کی بجائے دوسروں پر اپنی توقعات وابستہ کر لیتا ہے۔ جس کی وجہ سے جدید دور ہونے کے باوجود خود انحصاری کی کمی کی وجہ سے پاکستان ترقی کی منازل طے نہیں کر رہا۔ مسلمہ اقدار اور ادب ریزہ ریزہ ہو گئے ہیں جس سے فکری تناؤ میں اضافہ ہوا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

"جدیدیت صرف اس وقت نمودار ہوتی ہے جب فکری تناؤ ایک ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں مسلمہ اقدار اور آداب ریزہ ریزہ ہونے لگتے ہیں۔ اقدار و آداب کی ایک نئی کھیپ وجود میں آنے کے لیے بے قرار ہوتی ہے۔"(۵۷)

پاکستان بنیادی طور پر ایک زرعی ملک ہے۔ پاکستان کی دیہاتی آبادی کا زیادہ تر حصہ زراعت سے

روز گار حاصل کرتا ہے۔ان میں سے بہت سے لوگ بلاواسطہ اور بلواسطہ طریقے سے زراعت کے شعبے سے جڑے ہوئے ہیں۔ملک کی خام قومی پیدوار میں سب سے زیادہ حصہ زراعت کے شعبے سے حاصل ہوتا ہے۔زراعت کے شعبے نے افرادی قوت کے بہت سارے شعبے کو روز گار دیا ہوا ہے۔ملک کی بر آمدات کا زیادہ تر حصّہ زراعت کے شعبے سے حاصل ہوتا ہے۔

اس دور میں جہاں زرعی شعبے نے جدید ٹیکنالوجی اور مشینری کے استعمال سے ترقی کی تو دوسری طرف جدید ٹیکنالوجی کے استعمال سے بہت سارے مسائل سامنے آئے۔خاص کر وہ لوگ جو زرعی شعبے سے منسلک تھے ان کو بے روز گاری کا سامنا کرنا پڑا، مشینوں کے استعمال نے بہت سارے ایسے افراد کو بے روز گار کر دیا جن کی روزی ایسے شعبوں سے جڑی ہوئی تھی جہاں پر ان لوگوں کی بجائے مشینوں کی مدد سے کام کیا جانے لگا۔پروفیسر شمشاد حسین رقمطراز ہیں:

> "دنیامیں آج بڑی تیزی کے ساتھ تبدیلی ہورہی ہے۔سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی اور نئے سماجی تہذیبی رجحانوں نے ایک نیاماحول پیدا کیا ہے۔پرانی اقدار اس ماحول کا ساتھ نہیں دے پارہی ہیں۔اس ٹکراؤ نے ہمارے نوجوانوں میں نسلی بعد اور تشخص کے بحران کا احساس پیدا کیا ہے۔"[۵۸]

جدیدیت کے دور کے بعد بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ان تبدیلیوں نے انسان کو اندر سے توڑ دیا۔ان کی وجہ سے ہر فرد انجانے خوف اور بے یقینی کا شکار نظر آنے لگا۔بے یقینی اور انجانے خوف کی وجہ سے ہر فرد معاشرے میں ہجوم ہونے کے باوجود خود کو تنہا محسوس کرنے لگا۔جدید دور کے اندر جہاں معاشرے کے اندر خوشحالی آتی ہے وہاں معاشرہ پہلے سے بہتر کی جانب رواں دواں ہوتا ہے۔پرانی روایات سے انحراف کر کے جدید روایات کواپنایا جاتا ہے۔جدید روایات کواپنانے کے بعد معاشرے کے اندر افراد میں مایوسی،ویرانی اور بے اطمنیانی جیسی کیفیات پیدا ہوتی ہیں۔معاشرے کا ہر فرد ان تبدیلیوں سے متاثر نظر آتا ہے۔جدیدیت نے ہر دور کے حالات اور ثقافتوں کے مطابق اپنا مفہوم بدلا۔یہ بات مکمل عیاں ہے کہ اس کی وجہ جدیدیت گزشتہ ایک صدی میں ابھرنے والی تحریکوں کا ایک مرکب ہے۔گزشتہ تحریکوں سے منسلک رہتے ہوئے آج بھی سرگرم عمل ہے۔ڈاکٹر رشید امجد لکھتے ہیں:

> "دو یا تین دہائیاں پہلے جدیدیت کی صورت آمیزے کی سی تھی۔جہاں رنگ برنگ اجزاء کی شناخت کی جاسکتی ہے۔لیکن اب اس کی صورت مرکب کی سی ہے۔جہاں

سب اجزاء نے یکجا ہو کر ایک نئی شکل بنا لی ہے۔ دوسرے یہ کہ ابھی کسی نئی ادبی تحریک کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہو رہی نہ اس کے امکانات پیدا ہوئے ہیں۔ اس لیے جدیدیت آج کی ایک زندہ تحریک ہے۔ جس میں رومانیت، ترقی پسندی اور حلقہ ارباب ذوق کے بنیادی خواص یکجا ہو گئے ہیں۔ اور یہ تینوں بڑی تحریکوں کا مثبت تسلسل ہے جو رواں ہے۔"(۵۹)

د۔ اردو فکشن میں فرد کے داخلی اور خارجی مسائل:

فکشن (Fiction) انگریزی زبان و ادب سے اردو میں متعارف ہوا، کیونکہ اس لفظ کو اردو میں رائج ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا اس لیے عموماً اس کی تفصیل جاننے کی ضرورت درپیش رہتی ہے۔ لفظ فکشن لاطینی (Latian) زبان کا لفظ (Fingere) سے فکشن ہوتا ہوا انگریزی میں منتقل ہوا ہے اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ رائج ہو کر انگریزی کا ہو گیا۔ لفظ (Fingere) کے معنی To Form ہیں۔ اس مفہوم کو ذرا وسیع تر تناظر میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔ فکشن کے حوالے سے اپنی لغت میں شان الحق حقی نے "آکسفورڈ انگلش اردو ڈکشنری" میں، ڈاکٹر عبد الحق نے "دی اسٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری" میں مختلف تعریفیں کیں ہیں اور ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی معروف قومی انگریزی اردو لغت میں فکشن کے معنی یوں بیان کیے ہیں:

"تصوری، خیالی، تخیل زاد (خصوصاً فکشن کو خیالی کہانی) گھڑت، جھوٹ، افسانہ، ناول مختصر کہانی یا ناولٹ کی صورت میں خیالی واقعات کا نثری اظہار، گھڑنے یا خیال آرائی کا عمل۔"(۶۰)

فکشن ایسی تحریر ہے جس میں کئی واقعات یا کہانی کو بیان کیا جاتا ہے۔ حکایات، تمثیل، داستانیں ناول، افسانے، ناولٹ اور ڈرامے بھی فکشن کے زمرے میں آتے ہیں۔ منظوم داستانیں اور مثنویاں بھی فکشن کے زمرے میں آتی ہیں ان میں قصہ پن کا عنصر ملتا ہے۔

شان الحق حقی نے آکسفورڈ انگلش اردو ڈکشنری میں فکشن کی وضاحت درج ذیل الفاظ میں کی ہے:

"۱۔ افسانہ، طبع زاد، خیال، بیان، خیالی بات

۲۔ ادب، خصوصاً ناول خیالی قصوں اور کرداروں پر مبنی حکایت

۳۔ کوئی واہمہ جو عام طور پر مقبول ہو، Legal fiction، قانونی حیلہ، Fiction polite لطیف سخن سازی،

۴۔ اختراع، ایجاد، افسانہ طرازی، واہمہ سازی۔"(۶۱)

ایک تہذیب یافتہ معاشرے کی دین فکشن ہے، کہانی یا قصہ بیان کرنا با قاعدہ ایک فن ہے اس کے دائرہ کار میں وہ تمام تحریر آجائیں گی جن میں کسی نہ کسی طرح کہانی کا عنصر پایا جاتا ہے۔

ڈاکٹر عبد الحق نے فکشن کے متعلق یوں لکھا ہے:

"ا۔ گھڑت، من گھڑت، ایجاد، Fiction۔

۲۔ بنائی ہوئی بات، گھڑا ہوا قصہ، گھڑی ہوئی بات، بناوٹی بات۔

۳۔ افسانہ، فسانہ، کہانی، قصہ۔"(۶۲)

منظوم داستانیں اور مثنویاں بھی فکشن کے زمرے میں آتی ہیں جن میں قصہ کہانی یا واقعہ موجود ہو۔ اس طرح فکشن میں قصہ کہانیوں پر مبنی تمام ادبی سرمایہ شامل ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر زینت افشاں رقمطراز ہیں:

"فکشن کے حوالے سے یہاں وہاں جتنے بیانات ملتے ہیں ان میں کافی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے۔ اردو میں افسانوی ادب کے لیے انگریزی لفظ فکشن استعمال کیا جاتا ہے۔ اردو میں یہ لفظ اتنا معروف ہو چکا ہے کہ افسانوی ادب کی بجائے فکشن ہی مستعمل ہو چکا ہے۔ البتہ اس کے معنی و مفاہیم کی وضاحت مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے علمائے ادب نے اپنے اپنے انداز سے کی ہے۔ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ انگریزی کر کشن کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے لیکن اردو میں اس کا چلن عام نہیں۔"(۶۳)

لفظ فکشن کے مفاہیم پر غور کیا جائے تو بہت سارے اصناف سخن اس کے محیط میں سماتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ عالمی ادبیات میں اگر مصنوعی اعتبار سے دیکھا جائے تو رائج اصناف میں ناول اور افسانہ اس کے دائرے میں شامل ہیں۔ اس طرح ناولٹ اور افسانچہ کی دوسری اصناف سخن بھی فکشن ہی کا حصّہ ہیں۔

اردو فکشن کے حوالے سے دیکھا جائے تو اس کا ابتدائی نمونہ داستان کی صورت میں ملتا ہے۔ مرکزی قصہ انسانی زندگی کے ساتھ جڑا ہوا ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود بھی تخیل غالب ہوتا ہے۔ اردو کی نثری داستانوں کی تاریخ بہت زیادہ طویل ہے۔

ڈاکٹر رشید امجد لکھتے ہیں:

"داستان سے ناول اور پھر افسانے تک کا سفر کسی صنفی ارتقا کا تسلسل نہیں بلکہ انگریز

سرکار کی ان اصلاحات کا نتیجہ ہے جو فورٹ ولیم کالج اور انجمن پنجاب کے ذریعے نافذ کی گئیں۔۔۔ داستان بنیادی طور پر مسلم تہذیب اور مسلم تصور کائنات کا اظہار کرتی تھی۔"(۶۴)

اردو داستان کے ابتدائی نمونے دکن سے ملتے ہیں۔ عبداللہ قطب شاہی کی فرمائش پر لکھی جانے والی سب رس ملاوجی کا شاہکار نمونہ ہے۔ اس طرح اردو کا عربی اور فارسی سے بھی گہرا تعلق ہے۔ ایران اور عرب میں لکھی جانے والی کہانیاں اردو داستان کا حصّہ بن گئیں۔ کیونکہ انہی داستانوں کا ترجمہ اردو میں کیا گیا۔ ابن کنول رقمطراز ہیں:

"داستان کی یہ روایت دوسری زبانوں کی طرح اردو میں درآئی۔ کیونکہ اردو کا فارسی اور عربی سے بھی گہرا تعلق ہے۔ اس لیے ایران اور عرب میں پھیلی ہوئی کہانیاں بھی اس کا حصّہ بن گئیں۔ عرب کی مشہور داستانیں اردو میں ترجمہ ہوئیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ فارسی کی مشہور داستانیں میں زیادہ اور ایران میں کم لکھی گئیں۔ کلیلہ ودمنہ، داستان امیر حمزہ، بوستان خیال، گل بکاؤلی وغیرہ ہندستان کی فضا میں ہی تحریر کی گئیں۔ بعد میں ان کے ترجمے اردو میں ہوئے۔"(۶۵)

اردو فکشن میں داستان کے موضوعات رزم وبزم، عشق، مافوق الفطرت اور جنگی مہمات وغیرہ ہوتے تھے۔ بے ربطی کی وجہ سے داستان کا کوئی پلاٹ منظم نہیں ہوتا ہے۔

ہر زمانے کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ جہاں زندگی کے ہر شعبے میں تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں وہیں ادب کے اندر بھی انقلاب برپا ہوئے۔ داستان اس وقت مقبول تھی جب لوگوں کے پاس بہت سارا وقت فارغ ہوتا تھا۔ بدلتے ہوئے حالات اور مشینی دور کے باعث داستان کی اہمیت کم ہوگئی۔

داستان سے نکل کر ڈرامہ نگاری کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول ہوگئی۔ انیسویں صدی کے آخر تک باقاعدہ ڈرامہ نگار منظر عام پر آگئے۔ ان میں رونق بنارسی، غلام حسین ظریف، حافظ محمد عبداللہ فتح پوری جیسے قابل ذکر نام ہیں۔ لیکن اردو ڈرامے کا باقاعدہ آغاز سید آغا حشر امانت کے منظوم ڈرامے"، اندر سبھا" سے ہوا۔ اردو فکشن کے حوالے سے دیکھا جائے تو ڈرامے کی ابتدائی صورت واجد علی شاہ کے ڈرامے "رادھا کنیا" میں نظر آتی ہے۔ اردو ڈرامے کے ارتقا میں تھیر ٹیکل کمپنیوں نے اہم کردار ادا کیا۔ ابتداء میں ڈرامے سٹیج پر ایکٹ کر کے پیش کیے جاتے تھے۔ اور یوں ڈرامے نے ابتدا میں ترقی کی منازل طے کرنا شروع کر

دیں۔ڈرامہ زندگی کے قریب تر کے پیش کیا جانے لگا۔ڈاکٹر محمد قاسم لکھتے ہیں:

"اردو والوں نے ڈرامے کو کبھی قابل اعتبار صنف نہیں سمجھا۔بلکہ محض تفریح اور وقت گزاری کا ذریعہ سمجھ کر نظر انداز کرتے رہے۔ابتدا میں معتبر ادیب اور شاعر اس کی طرف متوجہ نہیں ہوئے اور یہ ایسے لوگوں کے ہاتھوں پروان چڑھتا رہا جن کی کوئی خاص ادبی حیثیت نہیں تھی۔جو پارسیوں کے اردو تھیٹر تنخواہ دار ملازم تھے۔اور ان کے تجارتی اغراض پوری کرنے پر مجبور تھے۔وہی کچھ لکھتے تھے جو ان کے آقا ان کو حکم دیتے تھے۔اس لیے ان کے لکھے ہوئے ڈرامے سٹیج کے لیے تو کامیاب ڈرامے تھے مگر ان کی ادبی حیثیت کچھ زیادہ نہ تھی۔"(۶۶)

ابتدا میں ڈراموں کی ابتدائی صورتحال کو دیکھا جائے تو سٹیج پر ایکٹ کر کے پیش کیا جاتا تھا۔اگرچہ یہ ان کی کوئی ادبی حیثیت نہیں تھی مگر وقت کے ساتھ ساتھ نہ صرف ان کو ادبی حیثیت دی گئی بلکہ ادیبوں،شاعروں اور ڈرامہ نگاروں نے اس صنف کی طرف خاص توجہ مبذول کی۔ڈرامہ سٹیج پر عملی طور پر کر کے دیکھانا کے حوالے سے جانا جاتا ہے۔اس حوالے سے دیکھا جائے تو کرنا یا کر کے دکھانا کے ہیں۔عملی صورت میں ایکٹ کرنا ہی ڈرامہ کہلاتا ہے۔ڈاکٹر قمر رئیس لکھتے ہیں:

"ڈرامہ جس کے معنی ہیں کرنا یا کر کے دکھانا۔سنسکرت میں اسے درشیتہ کاؤاور رویک کہا گیا۔یعنی ایک نظم جسے عملی صورت میں دیکھا اور دکھایا جاسکے۔ناٹک،رویک ہی کی ایک مقبول اور پسندیدہ قسم ہے۔اس طرح ڈرامہ اور ناٹک کو جو اصلاحی مفہوم مروج ہوا وہ یہ ہے کہ یہ ایک ایسی صنف ادب ہے جس میں زندگی کے حقائق اور مظاہر کو اشخاص اور مکالموں کے وسیلے سے عملاً پیش کیا جائے۔"(۶۷)

ڈراموں میں چونکہ کسی بھی کہانی کو عملی صورت میں ایکٹ کر کے پیش کیا جاتا تھا۔یہ کہانی فرد کے داخلی اور خارجی مسائل پر مبنی ہوتی تھی۔جس کی وجہ سے لوگ ڈراموں کو زیادہ شوق سے دیکھنے لگے اس طرح اس صنف کو بہت پذیرائی ملی۔

ناول کہانی اور قصے سے سے الگ صورت میں ہوتا ہے۔انسانی زندگی قصے اور کہانی کے ساتھ ہی جڑی ہوتی ہے۔ناول کے اندر بھی انسان کے حقیقی واقعات کو مد نظر رکھ کر کہانی تشکیل دی جاتی ہے۔ناول نے انسانی زندگی کی خاص سطح پر جنم لیا جب انسان کا شعور پختہ ہو گیا تھا۔کیونکہ ناول کا مقصد داستان کی طرح

تفریح طبع نہیں تے تھابلکہ انسان کی زندگی کا عکاس ہوتا ہے۔

ناول لاطینی سے فرانسیسی اور فرانسیسی سے انگریزی میں منتقل ہوا۔یوں اردو فکشن میں ناول انگریزوں کی دین ہے۔ناول کے لغوی اور اصطلاحی مفہوم کے حوالے سے دیکھا جائے تو ناول کی تعریف مختلف لغات میں مختلف حوالوں سے ملتی ہے۔قومی انگریزی اردو ڈکشنری میں ڈاکٹر جمیل جالبی ناول کے حوالے سے رقمطراز ہیں:

> "ناول خاصا طویل افسانوی نثری قصہ جس میں کم و بیش پیچیدہ پلاٹ کے ساتھ حقیقی زندگی کے کردار،افعال اور مناظر پیش کیے جاتے ہیں۔"(۶۸)

ناول نے کہانی، داستان اور قصے سے جنم لیا ہے۔حالانکہ ناول بھی داستان کی طرح طویل ہوتا ہے۔لیکن ناول میں وسط ہونے کے باوجود بھی اس میں دلچسپی کا عنصر بھی غالب ہوتا ہے۔دونوں اصناف کو دیکھا جائے تو داستان میں تخیل کا عمل دخل ہوتا ہے جبکہ ناول میں حقیقت نگاری کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ناول زندگی کے قریب تر ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ناول داستان سے زیادہ اہمیت کا حامل ہو گیاہے۔اس حوالے سے ڈاکٹر محمد احسن فاروقی لکھتے ہیں:

> "ناول کا سب سے اہم عنصر قصہ یا کہانی ہے۔عام طور پر ناول کو محض قصہ ہی سمجھا جاتا ہے۔عام ناول میں قصے کے سوا کچھ اور ہوتا بھی نہیں مگر اعلی سے اعلی ناول بھی بغیر قصے کے وجود میں نہیں آسکتا۔"(۶۹)

حقیقی ناول نگار معاشرے کی سچی تصویریں اور مختلف واقعات قاری کے سامنے لاتا ہے۔بدلتے ہوئے حالات، رجحانات اور رویوں پر مبنی کہانی ناول ہے۔ناول زندگی کی طرح مسلسل اور مربوط انداز میں گزارنے کا نام ہے۔

ہر نقاد اور محقق کی اپنی دلچسپی ہوتی ہے۔ناول کے حوالے سے کوئی مکمل بات نہیں کی جاسکتی۔کیونکہ وقت گزرنے کے ساتھ جہاں حالات بدلتے جاتے ہیں وہیں اس میں وسعت بھی آتی جائے گئی اور ہر ناول نگار وقت کے ساتھ اس میں نئے موضوعات اور انداز داخل کرتا جائے گا اور اسلوب میں بھی تبدیلیاں رونما ہوں گئیں۔عناصر ترکیبی کے حوالے سے دیکھا جائے تو اردو فکشن میں ناول کے چھ عناصر ترکیبی ہیں۔جن پر بیشتر ناقدین متفق ہیں۔پلاٹ، کردار، مکالمے۔دائرہ عمل یا ماحول، مقصدیت اور اسلوب وغیرہ۔

ناول کے آغاز وارتقا کا جائزہ لیا جائے تو اردو فکشن ڈپٹی نذیر کے ذریعے ایک نئے صنف میں داخل

ہوئی۔ مولانا الطاف حسین حالی نے "مجالس النسا" لکھا، رشید النسا بیگم نے "اصلاح النسا" کے موضوع سے ناول لکھا۔ اردو میں سلسلہ وار ناول نگاری کا آغاز پنڈت رتن ناتھ سرشار نے کیا۔ ان کا ناول "فسانہ آزاد" اودھ اخبار میں ۱۸۵۸ء سے ۱۸۵۹ء تک شائع ہوتا رہا۔ لوگوں کی دلچسپی کے باعث اس ناول کو کتابی صورت میں ۱۸۶۸ء میں تشکیل دیا گیا۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار کے دوسرے ناول بھی نمایاں اہمیت کے حامل ہیں۔ اردو فکشن میں ناول کو فروغ دینے والوں میں منشی سجاد حسین، علامہ راشد الخیری وغیرہ نے نمایاں خدمات سرانجام دی ہیں۔

ناول نگاری کی تاریخ میں عبد الحلیم شرر کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ انھوں نے اسلامی تاریخ کے زیادہ موضوعات کو فروغ دیا۔ اس میں "زوال بنداد"، "رومیہ اکبریٰ"، "حسن انجلینا"، "منصور موہنا" اور "فردوس بریں" قابل ذکر ہیں۔

پریم چند نے اپنے نظریات کا اظہار مختلف ناولوں میں کیا۔ ان کے ناولوں میں "گئودان"، "چوگان ہستی" اور "میدان عمل" وغیرہ ہیں۔ پریم چند نے تقریباً ایک سو دس کے قریب سماج میں فرد کے داخلی اور خارجی مسائل کے حوالے سے مختلف موضوعات میں مختلف کہانیاں لکھیں۔ ڈاکٹر صاحب علی لکھتے ہیں:

> "اردو اور ہندی افسانوی ادب میں منشی پریم چند کی تخلیقات شہرہ عام اور بقائے دوام سے متصف ہیں۔ بجا طور پر انہیں ناول کا بادشاہ قرار دیا گیا ہے۔۔۔ پریم چند ایک درجن ناول کے خالق ہیں۔ انکے تمام ناول ہندوستانی سماج کی معاشرتی، ثقافتی، تہذیبی اور جدوجہد آزادی کی معتبر دستاویز ہیں۔"[(۷۰)]

۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک نے ہندوستان کے اندر نئی راہ ہموار کی۔ بہت ساری تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ سجاد ظہیر نے ایک مختصر ناول "لندن کی ایک رات" کے حوالے سے لکھا۔ جس میں اس دور کے سماج کے داخلی اور خارجی مسائل کی عکاسی کی گئی۔ آصف فرخی رقمطراز ہیں:

> "لندن کی ایک رات" اس ناول کے ساتھ عجیب قصہ ہے کہ اس کا مصنف بھی افسانہ معلوم ہوتا ہے۔ ایک دیو زاد شبیہ جو ہمیں خائف کر دیتی ہے۔ خائف اس لیے کہ یہ دیو زاد ناول کے باہر نظر آتا ہے۔۔۔ ہم نے بہت سن رکھا ہے اور دیکھا ہے کہ سجاد ظہیر کا ناول ہے وہیں سجاد ظہیر اور ہمارے Responses متعین شدہ ہونے لگتے ہیں۔"[(۷۱)]

ترقی پسند تحریک سے متاثر ہونے والے ناول نگاروں میں کرشن چندر کا نام بھی اہم ہے۔ ان کے ناول "جب کھیت جاگے"، "آسمان روشن ہے"، "شکست"، لندن کے سات رنگ" اور "دوسری برف باری سے پہلے وغیرہ شامل ہیں۔ جس میں معاشرتی مسائل کی عکاسی کی گئی ہے۔

قیام پاکستان کے بعد اردو فکشن میں ناول کی صورتحال میں مختلف تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ جن کا جائزہ مختلف ناول نگاروں کے ناولوں سے لیا جاسکتا ہے۔ برصغیر کی تقسیم کے بعد جہاں نئی خواہشات نے جنم لیا وہیں بہت سے مسائل بھی پیدا ہوئے۔ اور ان مسائل کا حل حکمران نہ کرسکے۔ جس کی وجہ سے انسانی دکھوں میں بہت اضافہ ہوا۔ لاقانونیت، جبر، گھٹن، نارسائیوں، نفسیاتی کشمکش، جنسی بے راہ روی، عورتوں کے استحصال جیسے مسائل پیدا ہوئے۔ اس حوالے سے انتظار حسین، خالدہ حسین، نثار عزیز بٹ، خدیجہ مستور، فضل احمد کریم فضلی، عبد اللہ حسین، ممتاز مفتی، محمد خالد اختر، حجاب امتیاز علی، غلام عباس۔ اے حمید، جیلانی بانو، انیس ناگی، بانو قدسیہ، اشفاق احمد، فہیم اعظمی، الطاف فاطمہ، نشاط فاطمہ اور دوسرے ناول نگاروں نے مختلف موضوعات اور رجحانات کو اپنے ناولوں میں شامل کیا۔

بلراج کومل لکھتے ہیں:

> "آزادی کے بعد اردو ناول کا ایک حصّہ ان ناولوں پر مشتمل ہے جو تقسیم ہند سے پہلے اور بعد کے کچھ برسوں میں رونما ہونے والے ناخوشگوار واقعات، فسادات اور آبادی کے کرب آمیز ہجرتوں کا احاطہ کرتے ہیں۔ اس گنگا جمنی مشترکہ تہذیب کے بحران کو دائرہ اظہار میں لاتے ہیں۔ جو صدیوں کے سفر میں ہماری ثقافت کی بنیادی قدروں کے طور پر مستحکم ہو چکی ہیں۔ قرۃالعین حیدر۔ شوکت صدیقی، انتظار حسین۔۔۔ سب اقدار کے زوال وانہدام کے نوحہ خواں ہیں۔"(۴۲)

ان ناول نگاروں نے اپنے دور کے داخلی اور خارجی مسائل کے حوالے سے جزوی اور کلی سطح پر روشنی ڈالی ہے۔ ساٹھ کی دہائی کے بعد گھٹن، جبر، معاشرتی پابندیاں، داخلی کرب اور خارجی مسائل بہت زیادہ پیدا ہوئے۔ ان مسائل نے اس دور کے ناول نگاروں کو بھی براہ راست متاثر کیا اور ان پر بھی اثرات مرتب کیے۔ انہی اثرات کی بدولت اس دور کے ناول نگاروں نے وہ تمام حالات، داخلی اور خارجی مسائل کو اپنے ناولوں میں سمو دیا۔

اکہتر کی دہائی میں سقوط ڈھاکہ جیسا واقعہ رونما ہوا۔ جس نے فرد کو داخلی اور خارجی مسائل کی دلدل

میں پھنسا دیا۔ اکہتر کی دہائی میں فرد کو ہجرت کا المیہ، نفسا نفسی کا دور، سیاسی، سماجی اور اقتصادی سطح پر حالات کی کشید گی جیسے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی کی عکاسی مختلف ناول نگاروں نے کی جن میں قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، طارق محمود، رضیہ فصیح احمد، الطاف فاطمہ، نشاط فاطمہ، سلمیٰ کنول، فہمیدہ ریاض، جمیلہ ہاشمی، مستنصر حسین تارڑر اور انور سجاد شامل ہیں جنہوں نے ہجرت کے المیے، فسادات، عورتوں کے استحصال اور اس دور کے دکھ اور کرب سے جڑے فرد کو درپیش داخلی اور خارجی مسائل کی عکاسی کی ہے۔ صدیق سالک لکھتے ہیں:

> "مشرقی پاکستان میں مزید خون بہتا رہا۔ ظلم و ستم کا نشانہ زیادہ تر وہ غیر بنگالی تھے جو عوامی لیگ کے دشت پسندوں کے خلاف اپنا دفاع نہیں کر سکتے تھے۔۔۔ مشرقی پاکستان میں زیاتیاں صرف بنگالیوں پر نہیں ہوئیں، بلکہ غیر بنگالیوں پر بھی ہوئی ہیں۔"(۴۳)

اکیسویں صدی میں جدید دور ہونے کے باوجود بھی فرد کو دکھ اور کرب کی کیفیت سے دوچار ہونا پڑھ رہا ہے۔ اس دور کے اندر بھی نفسیاتی کشمکش، بے حسی، خوف، دہشت گردی جیسے مسائل نے فرد کو داخلی اور خارجی سطح پر متاثر کیا۔ اس قسم کی ساری عصری صورتحال کو سامنے رکھ کر ان کی عکاسی ناول نگاروں نے تحریری سطح پر کی ہے۔

ناول کے ساتھ ساتھ جس صنف نے ادب میں ترقی کی وہ افسانہ ہے۔ افسانہ کا باقاعدہ آغاز انیسویں صدی میں ہوا۔ مشینی دور کے بعد انسان اس قدر مصروف ہو گیا کہ اس کے پاس وقت کی بہت قلت ہو گئی۔ تو معاشرے کے پڑھے لکھے طبقے نے افسانے کی طرف اپنا رخ موڑا اور اردو فکشن کے اندر افسانے کو بہت پذیرائی ملی۔ بہت ہی کم عرصے میں افسانہ کی صنف اتنی مقبول ہو گئی کہ یہ گمان ہونے لگا کہ یہ صنف ادب میں بہت پہلے کی ہے۔

اردو ادب میں بیشتر اصناف فارسی سے اردو منتقل ہوئیں۔ لیکن بعض ایسی اصناف بھی ہیں جو انگریزی ادب سے اردو میں داخل ہوئیں۔ ان میں ایک نمایاں طور افسانہ بھی شامل ہے۔ انگریزی میں افسانے کے لیے Short storyیعنی مختصر کہانی کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے

افسانے نے بہت جلد مصنف اور قاری کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لی۔ اس کی ایک اہم وجہ افسانے کی نمایاں خصوصیات ایجاز و اختصار کے ساتھ ساتھ فرد کے مسائل کو ملحوظ خاطر رکھ کر افسانے لکھے گئے۔ جس

سے افسانہ اور افسانہ نگاروں دونوں کو پذیرائی ملی۔ڈاکٹر محمد حامد لکھتے ہیں:

"مختصر افسانے کا فارم ایسا نہیں ہے کہ اس میں مسائل حیات کی وسیع و عریض دنیا جگہ پا سکے۔اس میں زندگی کے کسی ایک حادثہ،ایک واقعہ،ایک پہلو اور کسی ایک جھلک کی تصویر سے زیادہ گنجائش نہیں ہے۔ مختصر افسانہ زندگی کے جلوہ ہائے صد رنگ کو پیش نہیں کرتا بلکہ وہ کسی ایک ہی جلوہ سے اپنا آئینہ خانہ سجاتا ہے۔"(۷۴)

جب افسانے میں افراد کے مسائل ان کی نفسیات کے مطابق اجاگر ہوئے اس سے افسانے میں قارئین کی دلچسپی بڑھنے لگی۔افسانہ ایک مخصوص حالات اور واقعات سے متاثر ہو کر ایک سانچے میں ڈالا جاتا ہے۔افسانہ نگار ایک خوبصورت اور دلکش انداز میں ان حالات کی عکاسی اس انداز سے کرتا ہے کہ قاری کی توجہ کا مرکز بن جاتا ہے۔یہی افسانے کے فن کی اصل کامیابی بھی ہوتی ہے۔افسانے کے اندر واقعات کو مختصر اور جامع انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔حالانکہ افسانہ کے اندر کہانی ایک ہی واقعے اور ایک ہی رخ کی عکاسی کر رہی ہوتی ہے۔لیکن اس کے باوجود بھی افسانے کے اندر باہمی ربط اور تسلسل پایا جاتا ہے۔تاہم افسانے اور ناول میں فرق موجود ہے۔وقار عظیم لکھتے ہیں:"ناول اور افسانے میں سب سے نمایاں فرق ان دونوں کا طول اور اختصار ہے۔اور صرف اس فرق کی وجہ سے دونوں میں بہت سے فنی اور لطیف فرق پیدا ہو گئے ہیں۔"(۷۵)

مختصر افسانہ لکھنے والوں میں پریم چند کا نام اہم ہے۔لیکن بہت سارے ناقدین اور محققین نے سجاد حیدر یلدرم کو پہلا افسانہ نگار کہا ہے۔یلدرم نے ترقی سے اثرات قبول کر کے افسانے کے اندر کہانیاں لکھیں۔جبکہ پریم چند نے اپنی ہی زمین سے جڑ کر سیاسی، سماجی اور معاشرتی حالات کے داخلی اور خارجی کرب جیسے مسائل اجاگر کیے۔

افسانہ کو چار ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔پہلا دور ۱۹۰۰ء سے ۱۹۳۰ء تک کا دور ہے۔دوسرا دور ۱۹۳۱ء سے ۱۹۴۷ء تک، تیسرا دور ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۰ء تک،اور چوتھا دور ۱۹۶۱ء سے تا حال پر مشتمل ہے۔افسانے ہر دور کے تقاضے، رجحانات اور ضرورت کے زیر اثر لکھے گئے۔اپنے اپنے دور کے اثرات قبول کر کے ہر دور میں افسانے پوری آب و تاب کے ساتھ نمایاں رہے۔ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

"ان ادوار کی حدود ایک دو سال آگے پیچھے کی جا سکتی ہے۔اس لیے کہ وہ ایک دوسرے سے کچھ اس طرح منسلک ہیں کہ ایک دور کے اثرات ور حجانات دوسرے دور میں،دوسرے دور کے تیسرے میں اور تیسرے کے چوتھے دور میں بھی آسانی سے

دیکھے جاسکتے ہیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ہر دور کے اثرات ورحجانات بقیہ ادوار میں بھی
کسی نہ کسی صورت میں زندہ رہے ہیں۔ البتہ حاوی رحجانات کی حیثیت میں وہ ایک
دوسرے سے الگ اور قابل امتیاز ہوگئے ہیں۔"(۷۱)

افسانے کا دوسرا دور جو ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۷ء کے عرصے پر محیط ہے۔ یہ وہ دور تھاجب لوگوں میں ذہنی اور سیاسی بیداری شروع ہوگئی۔ انگریزوں کے خلاف نفرت کے جذبات ابھر کر سامنے آگئے۔ معاشرے کے اندر سب سے زیادہ حساس ترین افراد تخلیق کار ہوتے ہیں۔ جن پر حالات واقعات کا زیادہ اثر مرتب ہوتا ہے۔ انھوں نے اردو فکشن کو تازہ فکر اور نئی سوچ سے اجاگر کیا ہے۔ افسانہ نگاروں نے کارل مارکس کے نظریات کو مد نظر رکھ کر افسانے تخلیق کیے اور کچھ افسانہ نگاروں نے فرائیڈ کے اثرات کو بھی قبول کیا۔

احمد ندیم قاسمی نے بھرپور طریقے سے فرد کے داخلی اور خارجی مسائل کو اپنے افسانوں میں اجاگر کیا اور ان مسائل کی طرف توجہ دلوائی۔ اس طرح شفیق الرحمٰن، حسن عسکری، قرۃ العین حیدر نے بھی اپنے دور کے سماجی اور سیاسی حالات کو مد نظر رکھ کر فرد کے داخلی اور خارجی مسائل کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ ان لکھنے والوں کو قیام پاکستان کے بعد بھی نمایاں شہرت حاصل رہی ہے۔

تیسرا دور ۱۹۴۷ء تا ۱۹۶۰ء کے عرصے پر محیط ہے۔ اس دور کے اندر مختلف مسائل ایک نئے انداز میں سامنے آئے۔ مثلاً قتل وغارت گری، ہجرت کا المیہ، فسادات، امرانہ رحجانات جیسے مسائل غالب ہوئے تو افسانہ نگاروں نے بھی انہی موضوعات کو مد نظر رکھ کر اپنے اپنے افسانے تخلیق کیے۔ انتظار حسین، مرزا ادیب، جیلانی بانو، شفیق بانو، واجد تبسم، قدرت اللہ شہاب، اے حمید، شوکت صدیقی، غلام عباس وغیرہ جیسے تخلیق کاروں نے اردو افسانے کو مختلف موضوعات سے روشناس کیا۔

پاکستان تاریخ میں قیام پاکستان کے بعد ایک بہت بڑے سانحے سے گزرا۔ اس سانحے نے ملک کو جنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اس سانحے نے ملک کے ہر فرد کو متاثر کیا۔ تخلیق کار کسی بھی ملک احساس ترین فرد ہوتا ہے تو تخلیق کاروں نے اپنے افسانوں کے اندر اس دکھ اور کرب کو نہایت عمدہ انداز میں پیش کیا ہے۔ اپنے جذبات، احساسات، دکھ اور کرب کو کھل کر اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔ نئیر مسعود لکھتے ہیں:

"آزادی کے بعد کچھ موضوع ختم یا کمزور ہو گئے۔ لیکن کچھ موضوع سامنے بھی
آئے۔ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اردو افسانے نے آزادی کی بجائے تقسیم کو اپنا خاص
موضوع بنایا۔ تقسیم کے بعد ریاستوں کے الحاق، خاتمہ، زمین داری، طبقاتی الٹ

پلٹ،اقدار کی تبدیلی وغیرہ نے افسانے کو بہت سے موضوع اور ان موضوعات نے بہت سے واقعات دیے۔"(۷۷)

ساٹھ کی دہائی میں مشینی دور کا آغاز ہو چکا تھا۔اس دور میں ایک انسان دوسرے انسان سے بہت دور ہو گیا۔ مشینی دور نے انسان کو مایوسی، تنہائی، اکیلا پن، قنوطیت جیسے مسائل سے دوچار کر دیا۔ساٹھ کی دہائی کے بعد ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ اور ۱۹۷۱ء میں سانحہ سقوط ڈھاکہ نے فرد کے داخلی اور خارجی مسائل میں اور بھی اضافہ کر دیا۔دکھ اور ہجرت کے مسائل کی وجہ سے ملک کے اندر بھی شدید بحران پیدا ہوا۔سقوط ڈھاکہ حادثہ نہیں تھا بلکہ ملک کے اندر حکمرانوں کی نااہلی تھی۔جس نے قیام پاکستان کے ان لمحات کو تازہ کر دیا جن میں افراتفری، فسادات، ہجرت کا المیہ، عورتوں کا استحصال جیسے مسائل ایک بار پھر ابھر کر سامنے آئے۔اور دوسری طرف ملک کے اندر مارشل لاء کے نفاذ نے جبر، انتشار، اور ذہنی کرب کو اور ہوا دی۔ان تمام مسائل کا اثر تخلیق کاروں پر بہت زیادہ ہوا۔ تخلیق کاروں نے نئے موضوعات کو جگہ دی۔

انتظار حسین، غلام الثقلین نقوی، رشید امجد، خدیجہ مستور، ممتاز مفتی، مشتاق قمر، عنایت اللہ، الطاف فاطمہ وغیرہ ایسے تخلیق کار ہیں جنہوں نے ستر کی دہائی میں بھیانک اثرات کو مد نظر رکھ کر مختلف موضوعات پر قلم اٹھا کر مسائل کی عکاسی کی۔ان افسانہ نگاروں نے فرد کے داخلی اور خارجی دونوں طرح کے مسائل پر قلم اٹھا کر ان مسائل کی جانب توجہ مبذول کروائی۔نازیہ ملک رقمطراز ہیں:

"ستر کی دہائی میں جو افسانہ نگار ہمارے سامنے آتے ہیں ان میں انتظار حسین، غلام الثقلین نقوی، رشید امجد، خدیجہ مستور، فرخندہ لودھی۔۔۔ اے حمید وغیرہ شامل ہیں۔جنہوں نے ستر کی دہائی کے تمام عصری حالات افسانوں کے موضوعات میں سمو کر ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیے ہیں۔تاکہ آئندہ کے لیے ایسے حالات پیدا نہ ہوں جو ملک کو ابتری کی طرف لے جائیں۔"(۷۸)

اسّی کی دہائی میں بھی ملک شدید بحران کا شکار تھا۔مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا بحران، بنگلہ دیش کا الگ ملک کی حیثیت سے وجود اور جنرل یحیٰی خان کے اقتدار سے الگ ہونے کے اعلان کے نتیجے میں ملک کے اندر ایک نئی فضا پیدا ہوئی۔ذوالفقار علی بھٹو دستور کے بننے تک صدر کے عہدے پر فائز رہے۔وہ دستور بننے کے بعد وزیراعظم بن گئے۔ملک کی بھاگ دوڑ ان کے ہاتھوں میں چلی گئی۔

اس دور کے اندر ملک کو اقتصادی، معاشی، سیاسی بحران کا سامنا کرنا پڑا۔ان حالات کی وجہ سے فرد

کے داخلی اور خارجی مسائل معاشرے کے اندر ابھر کر سامنے آئے۔ حالانکہ سماجی اور معاشی حوالے سے ملکی سطح پر کام کیا جارہا تھا۔ صنعتوں، بنکوں اور تعلیمی اداروں کی کمی کے باعث ان مسائل پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔ ملک کے اندر تعلیمی شعور کی بیداری کی وجہ سے غریبوں میں عزت نفس کا احساس ابھرا اور غریبوں کے اندر بھی اپنے حقوق کا شعور بیدار ہوا۔ لیکن اسّی کی دہائی میں جاگیر درانہ نظام پروان چڑھ گیا تھا۔ جس کی وجہ سے غریبوں کو بھی ان کے جائز حقوق نہ مل سکے۔ جاگیر داروں نے ملک کے انتظامی، ریاستی، سیاسی، معاشی امور میں بے جامداخلت کی اور ان مسائل میں اضافے کا باعث بنے۔

ان تمام حالات کے اثرات اس دور کے تخلیق کاروں پر براہ راست مرتب ہوئے۔ تخلیق کاروں نے فرد کے داخلی اور خارجی مسائل کے حوالے سے قلم اٹھایا۔ سماجی اور معاشرتی مسائل کو مدنظر رکھتے ہوئے ان پر کھل کر بات کی۔ ان لکھنے والوں میں احمد جاوید، احمد داؤد، اعجاز راہی، انور سجاد، محمد منشاء یاد، رشید امجد، مرزا حامد بیگ، مظہر الاسلام، منصور قیصر وغیرہ نے اسّی کی دہائی میں فرد کے داخلی اور خارجی مسائل کے حوالے سے مختلف موضوعات کو قلم بند کیا۔

اسّی کی دہائی میں مارشل لاء کے علاوہ یہودیوں کے ہاتھوں فلسطینی مسلمانوں پر ظلم و تشدد، فلسطینی مسلمانوں کا دوسرے ملکوں میں ہجرت کر جانا جیسے موضوعات نے اردو افسانے کے اندر بھی جگہ بنائی۔ اس حوالے سے انتظار حسین کا "کانا دجال" مظہر الاسلام کا "زمیں کا اغواء" اہم ہیں۔ نجم الحسن رضوی نے بھی ان مسائل کے حوالے سے تحریری صورت میں موضوعات قلم بند کیے۔ فرد کے داخلی اور خارجی مسائل کو اجاگر کیا۔ فرد کے احساسات اور جذبات کو تحریری صورت میں قارئین کے سامنے پیش کیا۔

افغانستان اور روس کے مابین ہونے والی جنگ اور اس جنگ سے پیدا ہونے والے داخلی اور خارجی مسائل کو بھی اس دور کے افسانہ نگاروں نے احسن انداز میں پیش کیا۔ نازیہ ملک رقمطراز ہیں:

> ۸۰ء کی دہائی کا افسانہ بھی اپنے ساتھ اپنے عہد کے ماحول، سیاسی و سماجی اور معاشی حقائق کو ساتھ لے کر چلتا ہے۔ متنوع موضوعات، اسالیب اور زبان و بیان کے افسانے میں فرد نے اپنے باطن کو موضوع بنایا ہے اور اپنی شناخت کو قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔"(۷۹)

۱۱ مئی ۱۹۹۸ء کو بھارت اور ۲۸ مئی ۱۹۹۸ء کو پاکستان نے جب ایٹمی دھماکے کیے تو اس حوالے سے بھی افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں خدشات کا اظہار کیا۔ ایٹمی دھماکوں کی وجہ سے جہاں یہ دونوں ملک

ایٹمی طاقت بن کر دنیا کے سامنے آئے وہیں دونوں ملکوں کے اندر نئے مسائل اجاگر ہوئے۔ان کی عکاسی افسانہ نگاروں نے تحریری صورت میں کی ہے۔اس حوالے سے انتظار حسین کا افسانہ "میرے اور کہانی کے بیچ" اور دوسرا افسانہ "مورنامہ" اور مبین مرزا کا "خواب ہارا آدمی"،ڈاکٹر شیر شاہ کا "ناسور"، گوہر ملک کا "بلوچ نے مجھے دھکا دیا"، آصف فرخی کا "خواب میں سفر"،اور منصور قیصر کا "سورج کی آواز" ایسے افسانے ہیں جو معاشرے کے اندر فرد کو درپیش داخلی اور خارجی مسائل کے حوالے سے بھرپور عکاسی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

۱۱ستمبر سانحے نے امریکی ادب کے ساتھ ساتھ پاکستانی ادب کو بھی متاثر کیا۔بہت سے ادباء، شعراء اور افسانہ نگاروں نے اس واقعے کی وجہ سے پیدا شدہ مسائل کو اپنی تحریروں میں شامل کیا۔پاکستان کی شہری زندگی، معیشت، سیاست اور معاشرت پر اس کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر کسی پاکستانی کے ملوث نہ ہونے کے باوجود اس سانحے نے پاکستان کے فرد کو داخلی اور خارجی سطح پر ہلا کر رکھ دیا۔اس کے بعد پاکستان بہت سارے مسائل جیسا کہ دہشت گردی کا سب سے زیادہ شکار ہوا۔

مسعود مفتی کا ۱۱ /۹ کے حوالے سے ان کا افسانہ "شناخت" ہے۔جس میں ۱۱ستمبر کے واقعے کے بعد غیر متوقع نتائج کو عنوان کے طور پر پیش کیا گیا۔افتخار نسیم کا افسانہ "پڑوسی"، خالدہ حسین کا "ابن ادم"، پرویز انجم کا افسانہ "مہاجر پرندے"، الطاف فاطمہ کا افسانہ "دید و دید" انور زیدی کا افسانہ "یہ جنگل کٹنے والا" حمید شاہد کی کہانی "سورگ میں سوڑ" ایسے افسانے ہیں جو فرد کو درپیش داخلی اور خارجی مسائل کو ۱۱ /۹ کے واقعے اور اس کے بعد پیدا ہونے والے حالات کو پیش کرتے ہیں۔

اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں رشید امجد، خالدہ حسین، مبین مرزا، حمید شاہد عاصم بٹ وغیرہ ایسے افسانہ نگار ہیں جنہوں نے اپنے افسانوں کے اندر معاشرے میں فرد کو درپیش داخلی اور خارجی مسائل کو باریک بینی سے دیکھا۔فرد کے احساسات وجذبات کو محسوس کیا۔اور ان مسائل کو اپنے افسانوں کے اندر تحریر کر کے قارئین کی توجہ مبذول کروانے کی کوشش کی۔

اکیسویں صدی کی دوسری دہائی میں دیکھا جائے تو بہت سارے ایسے افسانہ نگار جو پہلے بھی لکھ رہے تھے اور کچھ نئے چہروں نے ان موضوعات پر قلم اٹھایا جو معاشرے میں فرد کو داخلی اور خارجی سطح کے حوالے سے مسائل درپیش ہیں۔انھوں نے ان مسائل کو سامنے رکھ اپنے افسانے لکھے اور ان مسائل کے حل کی جانب توجہ مبذول کروائی۔ حمید شاہد،ڈاکٹر شفیق انجم، مبین مرزا، مظہر الاسلام،ڈاکٹر حمیرا اشفاق، منزہ

احتشام گوندل، علی اکبر ناطق، ابن مسافر ،عفت گل، شعیب خالق، افشاں عباسی، وغیرہ ایسے لکھاری ہیں جنہوں نے جدید معاشرے میں فرد کو درپیش داخلی اور خارجی مسائل کا جائزہ لیا اور ان مسائل کے حل کی جانب توجہ مبذول کروانے کی کوشش کی۔ انھوں نے اپنے افسانوں کے اندر اس حوالے سے تحریر کیا۔ ان کے افسانوں کو پڑھنے کے بعد معاشرے کی حقیقی صورتحال اور فرد کو درپیش داخلی اور خارجی مسائل قاری کے سامنے آجاتے ہیں۔ قاری ان مسائل کو اچھی طرح جان سکتا ہے۔ ان تمام افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں کے اندر اپنے اپنے انداز میں جدید معاشرہ کے افراد کو درپیش مسائل کی عکاسی کی ہے۔ تاکہ معاشرے کے افراد کی مشکلات کم ہو سکیں۔

حوالہ جات

۱۔ شعیب خالق سے راقم کا انٹرویو، بمقام کشمیر روڈ، صدر، راولپنڈی، بتاریخ ۲۶ جون ۲۰۱۹ء

۲۔ ایضا

۳۔ ایضا

۴۔ ایضا

۵۔ ایضا

۶۔ نوشیلہ انجم، شعیب خالق کے افسانے بے حرف لفظ اور ناولٹ آنٹی کا فنی اور فکری جائزہ، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء، ص ۱۶

۷۔ شعیب خالق سے راقم کا انٹرویو، بمقام کشمیر روڈ، صدر، راولپنڈی، بتاریخ ۲۶ جون ۲۰۱۹ء

۸۔ ایضا

۹۔ ایضا

۱۰۔ ایضا

۱۱۔ نوشیلہ انجم، شعیب خالق کے افسانے بے حرف لفظ اور ناولٹ آنٹی کا فنی اور فکری جائزہ، ص ۱۸

۱۲۔ وحید عشرت، ڈاکٹر، فلسفہ عمرانیات، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۱۱۷

۱۳۔ عبدالمجید سالک، تشکیل انسانیت، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۹۴ء، ص ۲۳

۱۴۔ احمد رضا، ڈاکٹر، اسلام کا معاشرتی اور سیاسی نظام، علامہ اقبال یونیورسٹی اسلام آباد، ۲۰۱۸ء، ص، ۲۳

۱۵۔ شعیب عتیق، ڈاکٹر، اردو کے افسانوی ادب پر فسادات ۱۹۴۷ء کے اثرات، بیکن بکس، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۱۰

۱۶۔ خالد علوی، ڈاکٹر، اسلام کا معاشرتی نظام (اسلام اور جدید معاشرتی نظریات)، الفیصل ناشران، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۴۴۴

۱۷۔ ارشد محمود، ثقافتی گھٹن اور پاکستانی معاشرہ، سٹی پریس بک شاپ، کراچی، اشاعت دوم، ۲۰۱۹ء ص ۱۴

۱۸۔ تجمل حسین عباسی، ہمارا معاشرہ، ابلاغ پبلیشرز اردو بازار، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۲۰

۱۹۔ احمد رضا، ڈاکٹر، اسلام کا معاشرتی اور سیاسی نظام، علامہ اقبال یونیورسٹی اسلام آباد، ۲۰۱۸ء، ص، ۲۳

۲۰۔ غلام کبریا، پیداوار، سماج اور صنعتکاری، فکشن ھاوس، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۹۹

21.Abdul Hameed Taga,Abdul Aziz Taga,Introdution To Sociology,Nadeem younus printing press ,Lahore,2009,page 149

۲۲۔ لیاقت حسین ہاشمی، ہم پیچھے کیوں ہیں؟، نگارشات پبلیشرز، لاہور، ۲۰۱۱ء، ص ۱۶۶

۲۳۔ خالد علوی، ڈاکٹر، اسلام کا معاشرتی نظام (اسلام اور جدید معاشرتی نظریات)، ص ۴۵۷
۲۴۔ ارشد محمود، ثقافتی گھٹن اور پاکستانی معاشر، ص ۱۶
۲۵۔ سہیل انجم، مترجم، تہذیبوں کا تصادم اور عالمی نظام کی تشکیل نو، آوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، س ن، ص ۸۲
۲۶۔ ابو الاعجاز صدیقی (مرتب)، کشاف تنقیدی اصطلاحات، طبع دوم، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء، ص ۵۹
۲۷۔ الطاف انجم، ڈاکٹر، اردو میں مابعد جدید تنقید (اطلاقی مثالیں و مسائل و ممکنات)، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی، اشاعت اول، ۲۰۱۳ء، ص ۶۶
۲۸۔ الطاف انجم، ڈاکٹر، اردو میں مابعد جدید تنقید (اطلاقی مثالیں و مسائل و ممکنات)، ص ۶۶
۲۹۔ عمر فاروق، ڈاکٹر، اصطلاحات نقد و ادب، اردو اکادمی، دہلی، اشاعت اول، ۲۰۰۴ء، ص ۲۵۸
۳۰۔ ایضاً، ص ۲۵۸
۳۱۔ آل احمد سرور، نظر اور نظریے، اردو اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۷ء، ص ۱۳۲
۳۲۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، اردو افسانہ، بیسویں صدی کی ادبی تحریکوں اور رجحانات کے تناظر میں، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء ص ۲۳۸
۳۳۔ آل احمد سرور، نظر اور نظریے، ص ۱۷۹
۳۴۔ احمد سہیل، ڈاکٹر، جدیدیت مابعد جدیدیت تقابل و تجزیہ، مشمولہ، سمبل، راولپنڈی، ۲۰۰۲ء، ص ۲۵۸
۳۵۔ گوپی چند نارنگ، جدیدیت کے بعد، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۵۱
۳۶۔ ناصر عباس نیئر، جدید اور مابعد جدید تنقید، (مغربی اور اردو تناظر میں)، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۲۰۰۴ء، ص ۳۲
۳۷۔ ایضاص ۲۳
۳۸۔ ایضاص ۳۴
۳۹۔ فتح محمد ملک، تحسین و تردید، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۵۰
۴۰۔ عصمت جمیل، ڈاکٹر، نسائی شعور کی تاریخ اردو افسانہ اور عورت، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، ۲۰۱۲ء، ص ۱۰۳
۴۱۔ اہم خالد فیاض، جدیدیت کی تحریک، مشمولہ، سمبل خاص شمارہ ۵، ص ۲۹۷
۴۲۔ محمد اشرف کمال، ڈاکٹر، تنقیدی تھیوری اور اصطلاحات، مثال پبلیشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۶ء، ص ۸۷
۴۳۔ ندیم احمد، ڈاکٹر (مرتب)، ترقی پسندی، جدیدیت مابعد جدیدیت، شاہین باغ ابو الفضل، نئ

دہلی، ۲۰۰۲ء، ص ۱۹۳
۴۴۔ شمیم حنفی، جدیدیت اور نئی شاعری، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۴۵
۴۵۔ جاوید، قاضی، وجودیت، فکشن ھاوس، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص ۱۱
۴۶۔ تبسم کشمیری، ڈاکٹر، نئے شعری تجزیے، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۷۸ء ص ۵۲
۴۷۔ ناصر عباس نئیر، اردو تنقید میں جدیدیت کے مباحث، مطبوعہ، دریافت شمارہ ۳ ستمبر ۲۰۰۴ء، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، ص ۲۸۴
۴۸۔ اقبال آفاقی، ڈاکٹر، مابعد جدیدیت فلسفہ و تاریخ کے تناظر میں، مثال پبلیشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۳ء ص ۱۴۷
۴۹۔ ممتاز احمد، ڈاکٹر، وجودیت منظر و پس منظر، مطبوعہ، فنون، لاہور، جولائی، اگست، ۱۹۶۶ء، ص ۸۸
۵۰۔ شمیم حنفی، جدیدیت اور نئی شاعری، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۳۳۲
۵۱۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، مغرب میں نفسیاتی تنقید، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۱۴۷
۵۲۔ جاوید، قاضی، وجودیت، ص ۱۱
۵۳۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، ادب اور کلچر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۲۸۶
۵۴۔ شمیمہ بیگم، ڈاکٹر، ترقی پسند تنقید کا ارتقاء اور احتشام حسین، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۸۷ء، ص ۴۵۴
۵۵۔ نازیہ یونس، ڈاکٹر، قتیل شفائی کی نظموں میں عورت کا المیہ، مشمولہ، دریافت، شمارہ ۱۸، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، ص ۱۲۲
۵۶۔ بینش فاطمہ، جدیدیت مابعد جدیدیت اردو نثر کے تناظر میں، مشمولہ، دریافت، شمارہ ۱۸، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، ص ۱۳۸
۵۷۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، سوال یہ ہے، اوراق، لاہور، ستمبر ۱۹۷۳ء، ص ۶۰
۵۸۔ شمشاد حسین، پروفیسر، انسانی کردار ایک نفسیاتی و معاشرتی تجزیہ، ترجمہ، ذکیہ مشہدی، خدا بخش اور نیٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۲۰۰۰ء، ص، ۱۴۸
۵۹۔ رشید امجد، ڈاکٹر، پاکستانی ادب رویے اور رجحانات، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۹۰
۶۰۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، قومی انگریزی اردو لغت، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۸ء، ص ۳۸۷
۶۱۔ شان الحق حقی، آکسفورڈ انگلش اردو ڈکشنری، آکسفورڈ پریس، کراچی، ۲۰۰۹ء، ص ۵۷۸
۶۲۔ مولوی عبد الحق، ڈاکٹر، دی اسٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۸۵ء، ص ۳۹۶
۶۳۔ زینت افشاں، ڈاکٹر، اردو فکشن پر سقوط ڈھاکہ کے اثرات، ادارہ یادگار غالب، کراچی، ۲۰۱۶ء، ص ۲۲

۶۴۔ رشید امجد، ڈاکٹر، جدید ادبی تناظر، الفتح پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۱۲ء، ص ۴۳
۶۵۔ ابن کنول، ڈاکٹر، داستان سے ناول تک، اسٹار آفسیٹ، دہلی، ۲۰۰۱ء ص ۱۶۲
۶۶۔ محمد قاسم، ڈاکٹر، اردو ڈرامہ نگاری کے ارتقاء میں بہار کا حصّہ، بہار اردو اکیڈمی، پٹنہ، ۱۹۹۷ء، اشاعت اول، ص ۷
۶۷۔ قمر رئیس، ڈاکٹر، اردو ڈرامہ انتخاب مع مقدمہ، سر سید بکڈپو، علی گڑھ، ۱۹۶۱ء، ص ۹
۶۸۔ جمیل جالبی، قومی انگریزی اردو لغت، ص ۱۳۲۸
۶۹۔ محمد احسن فاروقی / نور الحسن ہاشمی، ڈاکٹر، ناول کیا ہے؟، دانش محل، لکھنو، س ن، ص ۱۹
۷۰۔ صاحب علی ڈاکٹر، اردو فکشن کا مطالعہ، فکشن ھاوس، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص ۱۳
۷۱۔ آصف فرخی (مضمون)، لندن کی ایک رات، مشمولہ سجاد ظہیر ادبی خدمات اور ترقی پسند تحریک از گوپی چند نارنگ، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، ۲۰۰۷ء، ص ۵۹
۷۲۔ بلراج کومل، آزادی کے بعد اردو ناول انسانی اور سماجی سروکار، مشمولہ، آزادی کے بعد اردو فکشن مسائل ومباحث، مرتب ابو الکلام قاسمی، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، ۲۰۰۱ء، ص ۳۴
۷۳۔ صدیق سالک، میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا، الفیصل ناشران، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۵۹
۷۴۔ محمد حامد چھپروی، افسانہ کا ارتقاء، نظامی پریس لکھنو، ۱۹۸۶ء، ص ۴۳
۷۵۔ وقار عظیم، افسانہ نگاری، سرسوسی پبلشنگ ہاؤس، الہ آباد، س ن، ص ۴
۷۶۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو فسانہ اور افسانہ نگار سوانحی خاکے، تاریخی پس منظر اور تخلیق اول کی روشنی میں، مکتبہ، جامعہ، نئی دہلی، ۲۰۰۱ء، ص ۱۴
۷۷۔ نیر مسعود، آزادی کے بعد اردو افسانہ، مشمولہ، آزادی کے بعد اردو فکشن مسائل و مباحث، از مرتب ابو الکلام قاسمی، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، ۲۰۰۱ء، ص ۸۷
۷۸۔ نازیہ ملک، پاکستانی اردو افسانے میں عصری آگاہی: تجزیاتی مطالعہ، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، ۲۰۱۴ء، ص ۱۷۱
۷۹۔ ایضاص ۲۳۴

باب دوم:

شعیب خالق کے فکشن میں داخلی مسائل

شعیب خالق کا شمار اکیسویں صدی کے فکشن نگاروں میں ہوتا ہے۔ شعیب خالق بطور فکشن نگار بڑی فنکارانہ اور بڑی ذہانت سے معمولی سی معمولی بات کو اتنا پر تاثیر بنا کر پیش کرتے ہیں کہ کہانی پڑھنے والا کہانی ختم ہونے کے بعد بھی دیر تک سوچتا رہتا ہے۔ شعیب خالق اپنے فکشن کے اندر کہانی کا آغاز اس طرح کرتے ہیں کہ قاری توجہ اور دلچسپی کا مرکز بن جاتا ہے۔ شعیب خالق کے فکشن میں موضوعات کا تنوع پایا جاتا ہے۔ جہاں انھوں نے دیگر موضوعات کی طرف قارئین کی توجہ مرکوز کرنے کی کوشش کی ہے وہیں ان کے فکشن کا اہم موضوع جدید معاشرے کے اندر فرد کو درپیش داخلی مسائل بھی ہیں۔ جو بظاہر معمولی نظر آتے ہیں لیکن ان کے فرد کی زندگی پر گہرے اثرات ہوتے ہیں۔

شعیب خالق نے فکشن نگاری کے ذریعے زندگی کے رازوں سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ فکر کے طلسم میں ڈوبا مصنف استفہامیہ لہجہ اختیار کر کے کائنات کے وجود اور ذرے کے متعلق سوچ بچار کر کے فرد کے داخلی مسائل کی عکاسی کرتا ہے۔ شعیب خالق کی کہانیوں کا موضوعاتی دائرہ بہت وسیع ہے۔ ان کے فکشن کے کردار معاشرتی حقیقتوں کی عکاسی کرتے ہیں۔ شعیب خالق نے بڑی مہارت اور چابکدستی سے انسانی سائیکی کو دریافت کر کے فرد کے داخلی مسائل کے عکاسی کی ہے۔ بعض اوقات مسائل فرد کے باطن پر اثر انداز ہوتے ہیں اور یہی مسائل فرد کے داخل پر بھی براہ راست اثرات مرتب کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ بظاہر زندگی میں ہی نہیں بلکہ کائنات کے نظام سے بھی پیدا کردہ مسائل فرد کے مسائل بننے کا باعث بنتے ہیں۔

شعیب خالق نے اپنے فکشن کے اندر بول چال کے انداز کے ذریعے قارئین کو سوچنے پر مجبور کیا ہے کہ ہمارا اس کائنات میں وجود کیا ہے؟ انسان کیا ہے؟ یہی مختلف سوالات مصنف کو بھی خلا میں لے جاتے ہیں۔ اس کائنات میں ہونے والا ہر واقعہ انسان کی زندگی پر براہ راست اثرات مرتب کرتا ہے۔ چند حساس ذہن اور حساس طبعیت کے مالک لوگ ان واقعات کا گہرا مشاہدہ کرتے ہیں اور سوچ بچار کرتے ہیں کہ یہ واقعہ کیوں اور کیسے مرتب ہوا۔

شعیب خالق نے فکشن کے اندر بڑے فنکارانہ انداز میں معاشرے کے فرد کے داخلی مسائل کو مدنظر رکھ کر مختلف کہانیاں تحریر کی ہیں۔ کیونکہ شعیب خالق نے بھی اپنی زندگی میں بہت سارے ایسے واقعات اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں جنہوں نے فرد کے نہ صرف خارج پر بلکہ داخل پر بھی اثرات مرتب کیے ہیں اور

انسان کی داخلی کیفیات کو ان کی نفسیاتی کشمکش کے ساتھ پیش کیا ہے داخلیت کا تعلق فرد کی باطن کی دنیا سے ہوتا ہے فرد اپنے قلبی واردات اور اپنے نجی جذبات واحساسات میں ہی اپنی زندگی گزارتا ہے۔ اس طرح داخلیت اس کے باطن سے جڑی ہوئی ہوتی ہے۔ اس حوالے سے ابوالاعجاز صدیقی رقمطراز ہیں:

"ہر شخص دو دنیاؤں میں زندگی بسر کرتا ہے۔ ایک وہ خارجی دنیا جو اس کے اردگرد پھیلی ہوئی ہے اور دوسری وہ داخلی دنیا جو اس کی باطنی کیفیات، جذبات اور احساسات سے عبارت ہے۔۔۔ داخلی دنیا میں ان واقعات، اشیا اور اشخاص سے وابستہ ہمارا رد عمل ہے جو جذبات واحساسات کی متنوع صورتیں اختیار کرتا ہے۔"(۱)

اندرون بین افراد اپنی داخلی دنیا میں گم رہتے ہیں۔ داخلیت ان کے باطن کو متاثر کرتی ہے۔ اس طرح داخلیت کی دنیا اگر درست سمت میں جارہی ہو تو فرد تسکین محسوس کرتا

ابوالاعجاز صدیقی رقمطراز ہیں:

"داخلی واردات بھی کسی نہ کسی درجے میں خارجی واقعات کا رد عمل ہے۔۔۔ مخصوص طبع جب خارج کی جانب مائل ہو تو اگرچہ مطالعہ خارج میں اس کی داخلی کیفیات لازما دخیل ہوں گئی۔۔۔ مخصوص افتاد طبع داخلی واردات و کیفیات کی ترجمانی کی جانب مائل ہو تو اگرچہ اس کی داخلی کیفیت لازما کسی خارجی شے یا شخص یا واقعے سے منسلک یا اس کا جذباتی رد عمل ہو گئی تاہم اس میلان کو اصطلاح میں داخلیت کہا جائے گا۔"(۲)

دیکھا جائے تو لازمی طور پر داخلی دنیا خارجی دنیا سے بھی متاثر ہوتی ہے۔ خارجی سطح پر درپیش مشکلات انسان کو اندر سے اکثر توڑ دیتے ہیں۔ اس طرح سے وہ داخلی سطح پر کمزور ہو جاتا ہے اور اس کے مسائل میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ داخلیت خارجیت کے مقابلے میں اندرونی احساسات اور جذبات سے جڑی ہوتی ہے۔

پروفیسر انور جمال رقمطراز ہیں:

"اندرون بین لوگ اپنی داخلی ذات میں مگن رہتے ہیں۔ اندرونی جذبات اور داخلی احساسات کو ہی جنم دیتے ہیں جبکہ بیرون بین اس کے الٹ ہوتے ہیں۔"(۳)

داخلیت سے جڑے افراد اپنی داخلی دنیا میں مگن ہونے کی وجہ سے اپنی ذات ہی کی عینک سے اسے دیکھتے ہیں تاہم ماحول کی ابتری اور حالات کی خرابی وغیرہ بھی افراد کو داخلی سطح پر متاثر کرتی ہے۔

پروفیسر انور جمال رقمطراز ہیں:

"ادب میں داخلیت سے مراد یہ ہے کہ اپنے قلبی واردات اپنے نجی جذبات

واحساسات میں ہی اپنی تخلیقی زندگی گزارتا ہے۔ اگر وہ بیرون پر نظر ڈالتا بھی ہے تو
ذات ہی کی رینک سے اسے دیکھتا ہے۔ یہ رویہ کافی حد تک وراثتی ہے تاہم ماحول کی
ابتری، حالات کی دگرگونی وغیرہ بھی انسان کو داخلیت کا شکار کر دیتی ہے۔"(۴)

ساٹھ کی دہائی کے بعد تہذیبی، سماجی اور سیاسی مسائل منظر عام پر آئے۔ جدید دور کا آغاز ہونے کے باوجود بھی بہت سارے نئے مسائل نے سر اٹھایا۔ ملکی سطح پر سیاسی، سماجی اور اقتصادی مسائل مشکل ترین حالات سے دوچار تھے۔ ساٹھ کی دہائی کے بعد فرقہ ورانہ فسادات، خود غرضی، بدامنی اور مفاد پرستی نے ملکی فضا کو براہ راست متاثر کیا۔ جنس، گھٹن اور خود غرضی نے ملک کی اجتماعی صورتحال کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ایسے حالات میں فرد کو داخلی حالت زار جیسی کیفیت کا سامنا کرنا پڑا۔

ابتدائی چند دہائیوں میں ہی جدید معاشرے کا فرد تعلیم وتربیت کی رکاوٹ، کم سنی کی شادی اور دیگر مسائل سے دوچار ہوا۔ جس کی وجہ سے جدید معاشرے کا فرد ذہنی دباؤ اور جسمانی پابندیوں کا شکار ہوا۔ فرد کے داخلی مسائل کا باعث بننے والا جاگیردارانہ نظام ہے جس کی وجہ سے سماجی رویوں میں دوہرے معیارات نظر آتے ہیں۔ ہر انسان اپنے ماحول سے وابستہ اور مختلف رشتوں سے جڑا ہوا ہوتا ہے۔ چند حساس طبیعت کے مالک لوگ اپنے ماحول اور ارضی رشتوں سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ حادثات و سانحات براہ راست اور واضح انداز میں حساس طبیعت کے مالک لوگوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ادب کی دیگر اصناف کی طرح فکشن کے اندر بھی داخلی وخارجی زندگی کے بے شمار مناظر موضوع بنتے ہیں۔ جغرافیائی ماحول، تہذیب وثقافت، تخیل و رومان، احساسات وجذبات غرض انسانی زندگی کے ہر پہلو کسی نہ کسی صورت میں فکشن کا موضوع ہوتے ہیں۔

شعیب خالق کی بھی ہر کہانی کا رنگ اور ذائقہ جدا جدا ہے۔ اس وجہ سے ان کا رنگ بھی دوسرے تخلیق کاروں سے مختلف ہے۔ شعیب خالق نے تخلیقی کاوشوں کی بدولت فرد کے داخلی مسائل کو اجاگر کیا ہے اور قارئین کی توجہ مبذول کرنے کی کوشش کی ہے۔ داخلی مسائل کی وجہ سے ان کا افسانوی مجموعہ "بے حرف لفظ" نے مرکزی کردار ادا کیا ہے۔ ان کی تحریریں اچھوتی تحریریں ہیں۔ شعیب خالق رقمطراز ہیں:

"میں تو بالکل چھوٹا سا ہوں۔ خود کو بھی نہ دیکھ پائے، ایسا ذرہ، لیکن میری سوچ کی
آنکھیں، پھیلے ساگر، جن میں روشنی کا ہر ذرہ سورج سے تھوڑا سا بڑا ہے"(۵)

مصنف نے کسی حد تک فطرت کا مطالعہ کیا ہے۔ پیش لفظ کے بار میں شعیب خالق کہنا چاہتے ہیں کہ موت کا راز جو جان جاتا ہے وہ زندگی میں ہونے والے انقلابات سے متاثر نہیں ہوتا۔ زندگی گزارنے کے لیے

انسان کو اپنی حقیقت سے آگاہ ہونا بہت ضروری ہے۔

شعیب خلق نہ صرف خود روشنی سے واقف ہیں بلکہ سورج کی طرح انسان کی گہری سوچ سے بھی واقف ہیں۔اس کی عکاسی ان کی کہانیوں میں بھی کی گئی ہے۔شعیب خالق نے بطور فکشن نگار فرد کے داخلی مسائل کے حوالے سے مختلف مسائل کے حوالے سے کہانیاں لکھی ہیں۔جدید دور کے اندر فرد مختلف قسم کے مسائل سے دوچار ہیں۔

انسان کی حقیقت:

شعیب خالق کا افسانہ "خلیوں پر لکھی تحریر" ایک ایسا افسانہ ہے جس میں فرد داخلی مسائل سے دوچار نظر آتا ہے۔اس افسانے میں واحد متکلم کے کردار کے ذریعے فرد اپنی حقیقت کا متلاشی نظر آتا ہے۔وہ جاننا چاہتا ہے کہ اس کی ذات کی اصل اور حقیقت کیا ہے۔اس کا آغاز کہاں سے ہوا۔وہ اپنی حقیقت کی اصل تک رسائی چاہتا ہے۔اس طرح کے سوالات اس کے اندر پیدا ہوتے ہیں کہ وہ داخلی سطح پر بے چین دکھائی دیتا ہے۔انسان پر مختلف زمانے گزر چکے ہیں لیکن ابھی تک کوئی واضح حقیقت سامنے نہیں آئی۔انسان کی پیدائش کے حوالے سے مختلف قسم کے سوالات انسان کے اپنے ہی ذہن میں آتے رہتے ہیں۔ساٹھ کی دہائی میں آنے کے باوجود انسان کے ذہن میں ابھی تک یہ سوال موجود ہے کہ اس کا وجود کیا ہے؟اس کے وجود کی ابتدا کہاں سے ہوئی؟اس حوالے سے مختلف قسم کے علماء اور سائنسدانوں نے مختلف نظریات پیش کیے ہیں۔لیکن ابھی تک یہ بات واضح طور پر سامنے نہیں آسکی کہ وجود میں آنے کے باوجود انسان نے زبان کہاں سے سیکھنا شروع کی۔جس طرح آج کے معاشرے میں لوگ ایک دوسرے کو جانتے ہیں کیا اسی طرح ابتدا میں ہی انسان ایک دوسرے سے واقف تھے؟اہل کتب تو اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ انسان کی ایک ابتدا تھی کیونکہ ہر چیز کی تخلیق کسی نہ کسی مقصد کے تحت کی جاتی ہے لیکن انسان کی پیدائش کے حوالے سے ابھی یہ حقیقت واضح نہیں ہو سکی کہ انسان کی پیدائش کا کیا مقصد ہے؟شعیب خالق کے فکشن میں موضوعات کا تنوع ہے۔ان کی ہر کہانی پڑھ کر شدید تاثر پیدا ہوتا ہے وہ اپنی کہانی کے ہر موضوع کو احسن انداز سے قاری کے سامنے لانے کی کوشش کرتے ہیں۔وہ کمال طریقے سے اپنے تاثرات قاری تک پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنے مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ڈاکٹر نجیبہ عارف کہتی ہیں:

"ادیب جب بھی لکھتا ہے وہ چاہتا ہے کہ اس کو سنا جائے۔۔۔بعض اوقات ادیب تک

ہماری رسائی نہیں ہوتی لیکن ادیب ادب کے ذریعے ہمارے دلوں تک رسائی حاصل کرتا ہے۔۔شعیب خالق کی کہانیوں کے حوالے سے بات کی جائے تو شعیب خالق کی کہانیوں کو تسلسل سے نہیں پڑھا جا سکتا۔ ہر کہانی پڑھ کر ایک شدید تاثر پیدا ہوتا ہے اور افسانہ نگار کی سب سے بڑی خوبی بھی یہی ہے کہ جو احساس اس کے قلب پر تھا اسی احساس کا تاثر اس نے قاری کے دل پر براہ راست ڈالا۔"[۲]

انسان اور انسان کی پیدائش کے حوالے سے ہر انسان کے اندر مختلف سوالات پیدا ہوتے ہیں شعیب خالق نے بھی اپنی کہانیوں کے اندر انسانی ذات کے حوالے سے علامتی انداز میں سوالات اٹھائے ہیں۔ انسانی ذات کے حوالے سے شعیب خالق نے جو کچھ خود محسوس کیا اسی احساسات کو قاری تک منتقل کرنے کی کوشش کی ہے۔

اللہ نے انسان کو پیدا کر دیا ہے لیکن انسان دنیا میں آنے کے بعد بے شمار خامیوں سے پر ہو گیا ہے۔ تکبر، تعصب، نفرت، گھمنڈ گویا مختلف قسم کی خامیاں اس کے خمیر میں شامل ہو گئی ہیں۔ ہر انسان کے بس کی بات ہے کہ وہ برائیوں کو اپنا لے یا نیکیوں کے راستے پر چل نکلے۔ لیکن پیدائش کے بعد جوں جوں انسان شعور کی سطح پر جاتا ہے تو وہ اس بات کو بھول جاتا ہے کہ دنیا میں اس کے آنے کا مقصد کیا ہے؟ اس کے وجود کی کیا اہمیت ہے؟ لیکن انسان پیدائش کے بعد دنیا کی آرائش و زیبائش میں گم ہو جاتا ہے۔ وہ اس بات کو بھول جاتا ہے کہ اس کا مقصد حیات کیا ہے۔ انسان دنیا میں دولت، ہوس، لالچ جیسے مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ موت کا تصور بھی ذہن میں لانا گوارہ نہیں کرتا۔ موت تو ایک اٹل حقیقت ہے اس کے باوجود انسان اس حقیقت سے خود کو نا آشنا رکھنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ انسان اپنے آپ کو اس دنیا میں اس قدر گم کر لیتا ہے کہ موت کا تصور بھی اس کے ذہن میں نہیں آتا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل کی دولت سے مالا مال کیا ہے کہ وہ غور و فکر کرے، مختلف انداز سے سوچے۔ لیکن انسان خود کو اس قدر مصروف کر لیتا ہے کہ اس کو یہ فرصت ہی نہیں رہتی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کر سکے۔

انسان نے جہاں عقل و فہم کی منزل کو پایا وہیں انسان نے عقل و فہم کے بارے میں اپنے فائدے کے لیے سوچ و بچار کرنا شروع کر دیا۔ اپنے مستقبل کو بہتر بنانے کے لئے غیر اخلاقی، قانونی ہتھیار آزمانے لگا۔ اس دنیا کی باگ دوڑ میں انسان نے خود کو اس قدر مصروف کر لیا کہ اس کے پاس عبادت و ریاضت کے لیے وقت نہیں رہا۔ دنیاوی مسائل میں انسان جدید معاشرے کے اندر اس قدر الجھ کر رہ گیا ہے کہ جوانی سے بڑھاپے کی

خزاں کو پہنچ جاتا ہے لیکن مسائل اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ یہ دنیا فانی ہے لیکن انسان غور و فکر کرنے کی جستجو نہیں کرتا۔ آج کا انسان زندگی کے ہر میدان میں تصنع و بناوٹ سے کام لیتا ہے۔ اپنے گھر کی آرائش و زیبائش کے لیے قیمتی سی قیمتی اور مہنگی سے مہنگی چیزیں لے کر دوسروں کو کم تر گردانتا ہے۔ دکھاوے کے یہ شوقین لوگ خواہشات کی تکمیل میں اپنی پوری عمر گنوا دیتے ہیں۔ لیکن ان گھروں کے اندر اس کو رہنا تک نصیب نہیں ہوتا۔ بعض اوقات شارٹ سرکٹ سے بڑی بڑی مارکیٹیں اور دکانیں جل کر رہ جاتی ہیں تو یہ انسان کیا چیز ہے۔ اپنے آپ کو بڑا آدمی سمجھنے والا یہ انسان بالآخر مٹی کی خاک میں مل جاتا ہے۔ چلتا پھرتا اور صحت مند انسان بھی لمحے بھر میں زندگی کی رعنائیوں سے محروم ہو جاتا ہے۔ موت و حیات کے معاملے میں نہ اولاد کام آتی ہے نہ تعلقات کام آتے ہیں اور نہ ہی بادشاہت و زارت کام آتی ہے یہ سب تو اللہ تعالی کے اختیار میں ہے۔ نوشیلہ انجم لکھتی ہیں:

> "مصنف زندگی کے سفر میں آگے کے سلسلوں میں زندگی کی تلاش کے لیے معنی دریافت کرنے کا متلاشی نظر آتا ہے۔ کائنات میں اس تلاش کا سفر کر رہا ہے جبکہ اس کائناتی سفر میں بقول مصنف ہم آگے نہیں بڑھ رہے بلکہ پیچھے جانا چاہتے ہیں۔"(۷)

شعیب خالق نے اپنا افسانہ "خلیوں پر لکھی گئی تحریر" میں انسان کی حقیقت کی عکاسی ایک اور انداز سے بھی کی ہے کہ انسان کے وجود کی اہمیت کیا ہے۔ انسان ساری زندگی بہتر سے بہتر کی تلاش میں مگن رہتا ہے لیکن ایک دن خاک میں مل جاتا ہے۔ اس افسانے میں مصنف زندگی کے سفر میں زندگی کے لیے معنی تلاش کرنے کا متلاشی نظر آتا ہے۔ مکالماتی انداز میں یہ افسانہ انسان کی حقیقت اور کائناتی سفر میں زندگی کی تلاش کے لئے معنی دریافت کرتا ہے۔ اس افسانے کے ذریعے مصنف نے زندگی کی حقیقت کے حوالے سے مختلف انداز میں بحث کی ہے کہ زندگی کیا ہے؟ انسان کی تخلیق کیا ہے؟ وغیرہ جیسے سوالات پر مصنف نے مختلف انداز سے بحث کی ہے اور فرد کے داخلی مسائل کی عکاسی کی ہے جو جذبات اور احساسات کے ذریعے انسان کے اندر مسائل جنم لیتے ہیں۔ اس کی عکاسی شعیب خالق نے اپنے افسانے کے اندر اس طرح کی ہے:

> ہاں، تم اور میں، جسم کے ذرے ذرے میں، ہم دونوں کا عکس اور ہاں، اندر کا خوف ازلی وابدی ہے، ہم بہت لمبے سفر کے مسافر ہیں، یوں لگتا ہے جیسے کوئی سورج۔ جو ہماری دسترس میں نہیں آپا رہا ہے۔ ہمارے پیچھے متحرک ہے، جیسے اس میں ارتعاش ہے، جو آہنگ، لفظ اور آسیبت پھیلاتا رہتا ہے "(۸)

شعیب خالق کائنات انسان اور زندگی وغیرہ جیسے اہم سوالات کی عکاسی بھی اپنے افسانے "خلیوں پر لکھی تحریر "میں کرتے ہیں۔ مجموعی طور پر یہ افسانہ قاری کی فکر اور ذہن پر براہ راست اثرات مرتب کرتا ہے کیونکہ مصنف نے تحریری صورت میں انسان کی حقیقت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔اس افسانے کے ذریعے شعیب خالق نے زندگی کے سفر میں اور زندگی کی تلاش کے لیے معنی دریافت کرنے کی کوشش کی ہے۔انسان کی یہ حقیقت ہے کہ اس کی حیثیت ایک ایسے مسافر کی ہے جس نے ایک لمبا سفر طے کرنا ہے۔ جس طرح مسافر منزل پر پہنچ کر اپنا مقصد حاصل کر لیتا ہے اسی طرح انسان کی حیثیت بھی اس مسافر جیسی ہے جو زندگی میں سفر کرتا رہتا ہے آخر کار خاک میں مل جاتا ہے۔

اس افسانے میں انسان کی حقیقت کے حوالے سے مصنف نے مختلف زاویوں کے حوالے سے عکاسی کی ہے۔ جس طرح انسان بڑھتی عمر کے ساتھ اپنی شکلیں بدلتا رہتا ہے۔اسی طرح انسان کی سوچ میں بھی واضح تبدیلی آتی رہتی ہے۔سوچ میں منفرد تبدیلی کے باعث انسان اپنے وجود کے حوالے سے بھی سوچ بچار کرتا ہے کہ اس کائنات کے اندر اس کے وجود کی کیا اہمیت ہے؟اور اپنے وجود کے حوالے سے سوالات اور جوابات کا متلاشی یہ انسان اپنے وجود کے بارے میں غور وفکر کرتا ہے۔شعیب خالق نے انسانی وجود کی اہمیت کی عکاسی اپنے افسانے میں اس طرح کی ہے:

"زندگی کا یہ جرثومہ زدہ ریلا جو اس گولے پر نمودار ہوا۔اور اپنی شکل کی طرح سوچیں بدلتا ہوا آرہا ہے، کیا اس کی انتہا اس کائنات میں اپنے بنانے والے کی تلاش اور اس کائنات میں ختم ہو جائے گئی اور کیا ہمارے ہونے کا جواز اپنی تلاش میں کہیں چھپا ہوا ہے۔"(۹)

اس افسانے میں ایک اور اہم نقطے کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے کہ جس طرح انسان بڑھتی عمر کے ساتھ اپنی شکلوں میں تبدیلیاں لاتا ہے اسی طرح انسان کی سوچ شعور کی سطح تک پہنچ جاتی ہے۔شعور میں پختگی کے باعث انسان اپنی ذات اور وجود کا متلاشی نظر آتا ہے۔وہ دریافت کرنا چاہتا ہے کہ آخر انسان کی اہمیت اس کائنات میں کیا ہے اور اس کا وجود کہاں چھپا ہوا ہے۔شعیب خالق بطور فکشن نگار اس کائنات میں انسان کے وجود کے حوالے سے غور وفکر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔انسان کی حقیقت کی عکاسی انھوں نے اپنے افسانے کے ذریعے بھی کی ہے کہ انسانی وجود کا کوئی بھی نعم البدل نہیں ہے۔

نوشیلہ انجم لکھتی ہیں:

"یہ افسانہ قاری کے ذہن پر فکر اور شعور کی رو دوڑاتا ہے اور قاری تمام وقت تخلیق کار کے لفظی جادو کے سحر میں رہتا ہے۔اس افسانے کے الفاظ،تراکیب، تلازمات وغیرہ قاری میں فکر کا سامان پیدا کرتے ہیں اور قاری بہت جلد تخلیق کار کے ساتھ بحث میں شامل ہو کر ان تحریروں اور افسانوں میں خود کو ایک کردار محسوس کرتا ہے کہ زندگی کیا ہے؟کائنات کیا ہے؟انسان کی تخلیق کیا ہے؟ وغیرہ جیسے سوالات پر مصنف نے بحث کی ہے۔"[۱۰]

اس طرح انسان کی حقیقت کی عکاسی شعیب خالق نے اپنے افسانے " نقطے کا سفر میں " بھی واحد متکلم کے کردار کے ذریعے کی ہے۔اس افسانے میں زندگی کے وجود اور اپنے ہونے کی تلاش کو مکالماتی انداز میں پیش کیا ہے۔اس افسانے میں مصنف نے مختلف رنگوں کا ذکر کیا ہے۔ان میں سے ایک سبز رنگ کا بھی ذکر ہے جس کو مصنف نے زندگی کی صورت اور چہل پہل سے عبارت کر کے پیش کیا ہے۔ایک اور لال رنگ کا بھی ذکر ہے جس سے زندگی کے متحرک ہونے اور جوش ولولے کے رنگ کے ساتھ ملا کر پیش کیا ہے۔یعنی کہ زندگی میں ہر رنگ بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں کیونکہ زندگی چہل پہل اور حرکت کا نام ہے۔اور زندگی کی پہچان انسان کے وجود سے ہے۔اس کائنات کے اندر اگر انسان کا وجود ختم ہو جائے تو کائنات کی چہل پہل اور رنگارنگی بھی ختم ہو جائے گی۔انسان کی حقیقت بھی انسانی وجود سے ہے۔انسان کی حقیقت کے بغیر یہ دنیا بالکل ایک ذرے کی مانند ہے۔یہی ذرہ قاری کے ذہن میں فکر اور شعور پیدا کرتا ہے۔

شعیب خالق کے افسانے " نقطے کا سفر " کو دیکھا جائے تو ایک اور پہلو واضح ہوتا ہے کہ مصنف اپنے وقت سے بہت آگے کی سوچ رہا ہے۔جس میں وہ زندگی کے مختلف رنگوں کا بغور مشاہدہ کرتا ہے اور سوچتا ہے کہ ان رنگوں کی زندگی میں کتنی اہمیت ہے۔ان رنگوں کے بغیر زندگی محض ایک ذرہ بن جاتی ہے۔کائنات میں انسان کی حیثیت سر تاج کی ہے۔اسے خاص مقصد کے لیے دنیا میں بھیجا گیا ہے تاکہ وہ دنیا کے اندر اس مقصد کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ حاصل ہے اور وہ بہت سی دوسری مخلوقات پر فضیلت رکھتا ہے۔

اس طرح دیکھا جائے تو انسان اپنی اصل حقیقت کا ہمیشہ متلاشی رہا ہے۔ وہ جاننا چاہتا ہے کہ وہ کون ہے ؟وہ کیا ہے ؟اس کی حقیقت کیا ہے ؟اس کو دوسری مخلوقات پر فضیلت کیوں دی گئی ہے اور اس کو کس مقصد کے لیے دنیا کے اندر تخلیق کیا گیا ہے۔ ہمیشہ سے وہ ان سوالوں کا جواب حاصل کرنے کے لیے کشمکش میں مبتلا رہا ہے۔یہ فرد کی داخلی کیفیت ہوتی ہے جو اسے اس بات پر مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنے نفس سے سوال کرے،اپنے ضمیر کو ٹٹولے اور

سوراخ زندگی کے ساتھ ساتھ انسان اپنی حقیقت کو جاننے کی کوشش کرے۔ خالد سہیل لکھتے ہیں:

"سائنسی طرز فکر کا تعلق مادی حقائق اور ان کے باہمی رشتوں سے ہے۔ اس انداز فکر نے ہماری کائنات کو سمجھنے میں بہت مدد کی ہے۔ لیکن اس نے ہمارا اس حقیقت سے بھی تعارف کروایا ہے کہ وہ علم جو کیا ہے سے تعلق رکھتا ہے کیا ہونا چاہیئے کے بارے میں ہماری مدد نہیں کر سکتا۔"(۱۱)

شعیب خالق جدید معاشرے کے ایسے فکشن نگار ہیں جنہوں نے اپنے افسانے "نقطے کا سفر" میں انسان کی داخلی کشمکش کی تصویر کشی اس طرح کی ہے:

"گزرے ہوئے زمانوں کے گنجل میں وہ جیون کہانی کا سرا تلاش کر رہا تھا کہ یک دم اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے خود کو سونگھ لیا ہو، اپنی ہی خوشبو میں رچے بسے لمحے سانسوں کی راہ اس کے جسم میں پھیلنے اور سکڑنے لگے۔ پھر ہوا میں لاتعداد ذروں کے رنگ سر سے پاؤں تک کے سفر میں تیز رفتاری کے باوجود ذہین میں آکر کسی لمحے کی کمزور کروٹ کا سہارا لیتے ہوے ٹھہرتے اور سرکتے گئے۔"(۱۲)

انسان اپنی حقیقت کا متلاشی ہے۔ یہ اس کی داخلی کیفیت ہے جو اس کے وجود کے اندر سے اس سے سوال کرتی ہے کہ اس کی حقیقت کیا ہے؟ اس کا آغاز کیا تھا؟ اور اس کا اختتام کیا کیا ہو گا؟ وہ گزرے ہوئے زمانے کے گنجل میں بھی اپنی کہانی کے آغاز کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ اس سے وہ اپنی حقیقت اور اصل کو تلاش کرتے ہوے نظر آتا ہے اور اس سوال کے جواب کے لیے اس کی داخلی کیفیت اس کو اکساتی ہے۔

خالد سہیل لکھتے ہیں:

"انسانیت کی بقا کے لیے ضروری ہے کہ ہم بنیادی ضرورتوں کو فوقیت دیں اور عوام کے لیے روٹی، مکان، محبت اور آزادی کا اہتمام کریں۔ اور اس اہتمام کے لیے ہمیں امن، رواداری اور اپنے ماحول سے ذمہ درانہ سلوک کی ضرورت ہے۔ اگر ہم نظریاتی جنگ لڑتے رہے تو انسانیت ترقی کی نسبت تنزلی کی طرف قدم بڑھائے گئی اور ہم سب کے لیے دانش مندانہ بات نہ ہو گئی۔"(۱۳)

انسان کی داخلی دنیا اتنی وسیع ہے جو اس سے سوال پہ سوال کرتی ہے۔ انسان جب اپنی حقیقت کے متعلق جب کچھ جان لیتا ہے تو اس کی داخلی دنیا سے اسی حوالے سے ایک اور سوال سامنے آتا ہے اور جب وہ اس کا جواب تلاش کر لیتا ہے تو اس طرح سوالوں کا ایک لامحدود سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ داخلی کیفیت کا

تعلق انسان کے باطن سے ہے جو انسان سے لامحدود سوالات کرتی ہے۔ بعض اوقات انسان کو محسوس ہوتا ہے کہ اسے کسی سوال کا جواب مل گیا ہے تو ذہن کی کمزور کروٹ کا سہارا لینے کی کوشش کرتا ہے لیکن اس کا ذہن لامحدود سوچ کا مالک ہوتا ہے۔ انسان کی حقیقت کے اس سوال کا اگر جواب تلاش کیا جائے تو ہمارا دین اسلام بھی اس حوالے سے رہنمائی فراہم کرتا ہے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں سورۃ الذاریات میں ارشاد فرمایا: ترجمہ: "اور ہم نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لیے پیدا کیا کہ وہ میری عبادت کریں"(۱۴)

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی حقیقت اور اس کی دنیا میں آمد کے حوالے سے واضح طور پر اشارہ دیا ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے ایک مخصوص مدت کے لیے دنیا کے اندر بھیجا ہے اور اس کی زندگی کا مقصد صراط مستقیم کے راستے پر چلتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی بندگی کا حصول مقصود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس کی حقیقت سے آشنا کروایا ہے کہ دنیا کے اندر آنے کا مقصد اس کی ذات کی عبادت کر کے اس کی رضا کا حصول ہے۔ دنیا کے اندر انسان اپنی حقیقت کو تلاش کرتا ہے تو اسلام اسے واضح طور پر اس سوال کا جواب دیتا ہے۔ اس مقصد کے لیے اسے صراط مستقیم کے راستے پر چلنے کی اور احکام اعلیٰ پر عمل کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کی حقیقت اور اس کی ابتداء کے حوالے سے قرآن میں سورۃ العلق میں ارشاد فرمایا ہے: "ہم نے انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا۔"(۱۵)

قرآن مجید کی آیت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انسان کی زندگی کی ابتدا کے بارے میں واضح طور پر پتہ لگتا ہے کہ فرد کی زندگی کا آغاز ایک خون کا لوتھڑا ہے۔ یہ انسان کی زندگی کے آغاز کی حقیقت ہے کہ اس کا آغاز اس طرح ہوا۔

انسان کی اپنی حقیقت کے متعلق سوالات کا تعلق ان جزئیات اور احساسات سے ہے جو اس کے اندر جنم لیتے ہیں۔ جس کی بدولت وہ داخلی کرب کا شکار ہوتا ہے۔ اس طرح اس کرب کی وجہ سے اس کا نفس اس سے سوالات کرتا ہے کہ وہ دنیا میں کیوں پیدا کیا گیا؟ اس زمین کے اندر کون سی ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہے؟ اسے ساری دنیا سے ممتاز کیوں بنایا گیا ہے؟ فرد کی برتری اور فوقیت دوسروں پر کیوں اور کس بنیاد پر ہے اور جس طرح کی شکل و صورت، قد و قامت اور ہیت میں وہ منفرد ہے اس طرح کسی دوسری مخلوق کے اندر یہ موجود کیوں نہیں؟

نوشیلہ انجم لکھتی ہیں:

"نقطے کا سفر قوس و قزاح کے چند رنگوں سے مزین ہے۔ کہیں نیلے رنگ کا ذکر ہے

جو انسان اور کائنات کی وسعتوں کو ظاہر کرتا ہے تو کہیں سبز رنگ کا تذکرہ ملتا ہے۔جو زندگی کی صورت اور چہل پہل سے عبارت ہے۔ تیسرا رنگ لعل ہے جو زندگی کے متحرک ہونے اور جوش ولولے کا رنگ ہے۔"(۱۶)

انسان کی حقیقت کی عکاسی شعیب خالق نے اپنے افسانے "وائجر ٹو" میں کی ہے۔اس افسانے کے مطابق انسان کی ذات کی حقیقت ایک ایسے گولے کی ہے جو ایک سرے سے شروع ہو کر دوسرے سرے تک ختم ہو جاتی ہے۔ جس طرح ایک گولے کے گرد چکر مکمل ہوتا ہے اسی طرح انسان کی ذات کی حقیقت بھی یہی ہے۔وہ ایک گول چکر مکمل ہونے کے بعد خاک میں مل جاتا ہے۔شعیب خالق نے زندگی کی عکاسی کچھ یوں کی ہے:

"مگر میرے لیے تو ہے میٹھا ہے، قطعی میٹھا، زمین پر شعوری زندگی کو ہوش سنبھالے ابھی چند سال ہوئے ہیں اور زندگی نے اس گولے پر قلیل مدت میں اپنے سواری حصار سے باہر نکلنے تک کا سفر جس تیزی سے کاٹا ہے۔ کمال ہے یہ، جیسے جادو ہو۔میں تو کہتا ہوں زندگی کی اس کامیابی کا ایک بین الاقوامی جشن ہونا چاہیے، پورے گولے پر ایک دن چھٹی"(۱۷)

انسانی ذات کی یہ حقیقت ہے کہ جب انسان کا وجود ہے تب ہی انسان کی اہمیت ہے۔وجود صرف ایک گول چکر کاٹنے کے بعد اختتام پذیر ہو جاتا ہے۔

شعیب خالق نے اپنے افسانے "بے چہرہ زندگی" میں انسان کی حقیقت کی عکاسی ایک اور منفرد انداز سے کی ہے کہ جب تک انسانی وجود حرکت کرتا رہتا ہے تب تک اس انسان کی اہمیت ہوتی ہے۔ لیکن جیسے ہی اس کا وجود بے حرکت ہو جاتا ہے تو اس کے اردگرد کے لوگ بھی اسی وجود سے خوف کھانے لگتے ہیں۔شعیب خالق نے جدید معاشرے کے اندر قارئین کو غور و فکر کی دعوت دی ہے کہ یہ زوال پذیر معاشرہ ہے کہ جس میں انسان کی پل بھر میں اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔دن بدن آبادی میں اضافہ ہو رہا ہے اور اسی آبادی میں لوگ بھی مر رہے ہیں۔ مگر اس کائنات میں فرد کی شناخت اس کے وجود پر ہونے پر منحصر ہے:

"گہرے پیلے رنگ کی کوئی قے، یا حادثہ اس ایک زندگی کا خاتمہ ثابت ہو۔یہ ایک زندگی کیا ہوئی۔ ہوش کی بات کرو محض سائنسی ہوش، کوئی پیٹ نہیں بھرتا، رہنے کو گھر نہیں دیتا۔یہ ہوش کوئی بدن نہیں ڈھانپتا۔زندگی کے اس جسمانی طلوع میں کوئی

سائنس نہیں ڈوبتی، بلکہ ایک انفرادی اس زمین کے اوپر جلایا یا دفن کیا جاتا ہے۔کسی کی موت پر رشتہ دار، دوست احباب روپڑتے ہیں یا افسوس کرتے ہیں اور پھر بھول جاتے ہیں، لیکن یاد رکھنے سے دماغی کتاب جو بند ہو جاتی ہے۔وہ پھر اپنے پہلے عنوان سے تو نہیں کھلتی۔"(۱۸)

شعیب خالق فرد کے بارے میں پیدا ہونے والے سوالوں کے جوابات تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔فرد کی حقیقت اس کے وجود سے جڑی ہے لیکن جب اس وجود سے روح نکل جاتی ہے تو دوست احباب اور رشتہ دار پل بھر میں افسوس کر کے اس کو اس طرح بھول جاتے ہیں جیسے وہ تھا ہی نہیں۔مادی دنیا آسائش اور ترقیوں کے پیچھے بھاگنے والا فرد موت پر سبقت حاصل نہیں کر سکتا۔ایک معاشرے میں رہنے والا انفرادی انسان اپنی پہچان بنانا چاہتا ہے۔ہر چیز کا علم حاصل کرنا چاہتا ہے۔مگر موت کی وجہ سے یہی فرد معاشرے کے اندر بے نام احساس کی شاخ بن کر رہ جاتا ہے۔افسانہ "بے چہرہ زندگی "میں موت کا ہیبت ناک تصور بھی موجود ہے جو وجود کی انتہا یا پھر حقیقت کا نقطہ انجام ہے۔اسی نقطہ انجام سے ہر ذی روح کو گزرنا ہے۔موت کے تصور کی وجہ سے معاشرے میں فرد اجنبیوں کی طرح زندگی گزار دیتا ہے۔معاشرے کے اندر انسان کی حقیقت بھی یہی ہے کہ موت کی وجہ سے انسان دوسرے لوگوں سے اجنبی اور انجان ہو جاتا ہے۔اس ضمن میں یاسمین فاطمہ رقمطراز ہیں:

" آج کا انسان نام کا خول اپنے اوپر چڑھائے دوسروں میں امتیاز حاصل کرتا ہے۔نام کے خول کے اندر دھڑکتا گوداوہ خواہشات ہیں جن کی کوئی انتہا نہیں۔لیکن ہر نام والی چیزوں کے ساتھ ہزار پایہ موت بھی پیدا ہوتی ہے جو ہر چیز کا انجام ہے۔وجود کی بدنیتی کو ایکس رے رپورٹ سے ظاہر کیا گیا ہے۔انسان ہڈیوں کے ڈھانچے کے سوا کچھ اور نہیں ہے۔موت ایک اٹل حقیقت ہے جو ہر چیز کا اولین اور واحد مفہوم ہے۔"(۱۹)

جدید معاشرے کے اندر فرد کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے کہ وہ اپنے نام کا خول اپنے اوپر چڑھا کر دوسروں میں امتیاز حاصل کرنا چاہتا ہے۔دنیا کے اندر رہتے ہوئے خواہشات کا پتلا بن جاتا ہے لیکن دوسری چیزوں کی طرح ایک حقیقت موت بھی ہے جو ہر چیز کا انجام بھی ہے۔انسان کی حقیقت انسان کی ہڈیوں کا ڈھانچہ ہے۔روح نکلنے کے ساتھ ہی انسان نام سے بے نام ہو جاتا ہے۔

شعیب خالق اپنے افسانے "ڈور" میں فرد کی داخلی کیفیت کو سامنے رکھ کر واضح کرتے ہیں کہ جدید

معاشرے کے اندر فرد داخلی مسائل کا شکار ہے۔ کیونکہ فرد جدید دور سے تعلق رکھنے کے باوجود بھی اندھا پن رکھتا ہے۔ وہ اندھا پن جو اندھیرے میں کالی بلی کو ڈھونڈتا ہے۔ لیکن در حقیقت وہ کالی بلی کمرے میں موجود نہیں ہے۔ جدید معاشرے کے اندر فرد کی حیثیت ایک ایسی ڈور کی ہو گئی ہے جو آپس میں اس قدر الجھی ہوئی ہے جس کے سرے کا پتا ہی نہیں ہے۔ شعیب خالق نے اپنے افسانے "ڈور" کے اندر بھی فرد کی حقیقت کو ایک ایسی ڈور کے ساتھ تشبیہ دی ہے جو آپس میں اس قدر الجھی ہوئی ہے کہ بہت غور و فکر اور جستجو کرنے کے باوجود بھی اس کے سرے کا پتہ نہیں چلتا کہ آخر انسان کیا ہے؟ اس کا وجود کیا ہے؟ انسان کی ابتدا کہاں اور کیسے ہوئی۔ الغرض ایسے تمام سوالات کے جوابات مصنف چاہتا ہے۔ مگر یہ تمام جوابات اسی ڈور میں ایسے الجھے ہوئے ہیں کہ جن کے بارے میں جتنا غور و فکر کیا جائے وہ اتنے ہی الجھ جاتے ہیں۔

نوشیلہ انجم لکھتی ہیں:

> "انسان کی ابتدائی زندگی کی ڈور سلجھانے اور سرا آغاز ڈھونڈنے پر لکھا گیا ہے۔ یہ مختصر مگر خوبصورت تحریر ہے جس میں انسان کے بتدریج آگے بڑھنے اور ارتقائی منازل میں مختلف مذاہب کے حوالوں کا ذکر ملتا ہے۔"[۲۰]

"ڈور" افسانے کے ذریعے شعیب خالق انسان کی ابتدائی زندگی کی ڈور اور سرے کو ڈھونڈنے کے حوالے سے ایک کوشش کرتے ہیں۔ یہ مختصر مگر بہت ہی خوبصورت تحریر کردہ افسانہ ہے۔ جس میں انسان کے آگے بڑھنے اور ارتقائی منزل کا ذکر کیا گیا ہے۔ مگر موجودہ وقت پچھلے زمانے کے حائل سانسوں کا شکار ہے۔ مصنف نے فلسفیانہ انداز میں انسان کی حقیقت کو تحریر کیا ہے اور اس کی عکاسی یوں کی ہے کہ: "ہم سب خواب سانسوں میں گرفتار ہیں۔ سانسیں ہیں کہ لمحوں کی ڈور میں خود کو پروے چلی جا رہی ہیں۔ میں اس ڈور کو چھونا چاہتا ہوں۔"[۲۱]

شعیب خالق نے نہایت خوبصورت اور عمدہ طریقے سے انسان کی حقیقت کی عکاسی کی ہے۔ مصنف نے تحریر کے ذریعے نہایت پختگی کے ساتھ انسان کی حقیقت پر روشنی ڈالی ہے کہ انسان کا وجود نہایت اہم ہے۔ جدید معاشرے کا فرد بے خواب سانسوں میں گرفتار ہے لیکن سانسیں ایسی ڈور میں الجھی ہوئی ہیں کہ جس کے سرے کا بھی نہیں پتہ چلتا۔ انسان کے لیے ایک خاص وقت نہیں مقرر کیا گیا۔ اس کی سانسیں کسی بھی وقت اس ڈور میں الجھ جائیں گئیں۔ کیونکہ سانسیں لمحوں میں ڈور میں پرو ہی جا رہی ہیں۔ مصنف انسان کی حقیقت کی عکاسی کرتے ہوئے ان ڈوروں کو چھونا چاہتا ہے۔ ازل سے انسان کی فطرت میں تجسس اور حقیقت

تک رسائی کا جذبہ رہا ہے۔وہ جاننا چاہتا ہے کہ زندگی کیا ہے؟اس کی ابتدا کہاں سے ہوئی؟کائنات اور حیات کے بارے میں سوالات کے جوابات جاننے کی کوشش کرنا انسانی فطرت میں شامل ہے۔اظہار اثر لکھتے ہیں:"صدیوں سے ایک سوال انسان کو پریشان کر رہا ہے زندگی یا حیات کیا ہے؟یہاں زندگی یا حیات سے مراد انسانی زندگی نہیں بلکہ اس کے احاطے میں تمام جاندار آتے ہیں"(۲۲)

شعیب خالق کی تحریروں میں سائنسی رنگ بھی نظر آتا ہے۔سائنس کا مفہوم چاہے کچھ بھی ہو لیکن دراصل یہ فطرت کا مطالعہ ہے جس میں مشاہدات اور تجربات کی بڑی اہمیت ہے۔اس طرح تجسس انسانی جبلت کا حصّہ ہے جس سے فطرت کو جاننے کے بارے میں ترغیب ملتی ہے۔یہی سائنسی رنگ شعیب خالق کی تحریروں میں نظر آتا ہے۔وہ سائنسی حوالے سے بھی قارئین کی توجہ مبذول کرواتے ہیں۔

کائنات کی حقیقت:

شعیب خالق اپنے افسانے "نقطے کا سفر" میں فرد کے داخلی مسائل سے جڑے ایک اور مسئلے کی طرف اشارہ کرتے ہیں ۔فرد کی داخلی دنیا ہمیشہ اس سے کائنات اور اس کی حقیقت کے حوالے سے سوال کرتی ہے۔اس کے اندر کی دنیا کائنات اور اس کے رازوں کو جاننا چاہتی ہے۔کائنات کی حقیقت کا ادراک چاہتی ہے اور اس سے جڑی تمام باتوں کی حقیقت تک رسائی چاہتی ہے۔اس افسانے میں جہاں دیگر موضوعات ہیں وہاں کائنات کے حوالے سے مصنف سوال کرتا اور جواب دیتا نظر آتا ہے اور کائنات اور اس سے مطلق ہر حوالے سے ذکر ملتا ہے۔کائنات کے آغاز کے بارے میں ہر زمانے میں مختلف نظریے ہیں۔کائنات کی حقیقت کے حوالے سے دنیا میں مختلف مذاہب کے نظریات بھی شامل ہیں۔کائنات کے حوالے سے سائنسی نظریات بھی ملتے ہیں۔کائنات کی حقیقت اور تخلیق پر سب یقین رکھتے ہیں کہ کائنات کا وجود عدم سے ہے۔اس سے پہلے کچھ بھی نہیں تھا۔اسلامی تصورات کے مطابق دیکھا جائے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ خدا نے چاہا تو یہ معرض وجود میں آئی۔خدا نے لفظ کن فیکون یعنی ہو جا تو یہ کائنات بن گئی۔مختلف نظریات کے ماننے والے اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ زمین اور آسمان کو سات دنوں میں تخلیق کیا گیا۔نوشیلہ انجم لکھتی ہیں:"نقطے کا سفر افسانے کی تحریر قاری کے ذہن میں فکر اور شعور پیدا کرتی ہے۔اس کے الفاظ،تراکیب،اور تلازمات وغیرہ سوچ کی ایک شاعرانہ فضا قائم کرتے ہیں۔"(۲۳)

دیومالائی قصّوں میں زمین کو ازل سے ہی تسلیم کیا گیا ہے کہ زندگی کی تخلیق کا تصور بھی کائنات کی تخلیق کے ساتھ ہی معرض وجود میں آیا۔کائنات کی حقیقت کے حوالے سے بھی جہاں مختلف نظریات ملتے

ہیں وہاں سائنسی نظریات کو بھی مد نظر رکھا جاتا ہے۔ کہیں سائنس ابھی تک کائنات کی تخلیق کے حوالے سے کوئی خاص ثبوت پیش نہیں کر سکی۔ البتہ سائنس ابھی بھی غور و فکر کر رہی ہے کہ کائنات اصل میں کیا ہے۔ کیا اس کی محدود اور لا محدود سطحیں بھی ہیں۔ کائنات کے آغاز اور انجام کے حوالے سے سائنس ابھی بھی غور و فکر میں مبتلا ہے۔ کائنات کیسے وجود میں آئی۔ اس کا علم کہاں تک ہے۔ اس کا جواب ابھی تک سائنس نے حتمی طور پر پیش نہیں کیا۔ سائنس نے آغاز ہی سے کائنات کی حقیقت کے حوالے سے مطالعہ کیا لیکن کوئی خاص نظریہ ابھی تک پیش نہیں کر سکی۔ کائنات کا نظام چاند، سورج اور ستاروں کا وقت پر غروب اور طلوع ہونا کے حوالے سے مختلف ادوار میں مختلف نظریات پیش کر چکی ہے۔

لیکن کائنات وقت کے ساتھ ساتھ اور بھی وسیع ہوتی جا رہی ہے۔ جدید سائنسی دریافتوں کے باوجود بھی کوئی حتمی نتائج اخذ نہیں ہو سکے۔ کائنات مادی اور ابدی دنیا کا نام ہے۔ کائنات کی حقیقت کے حوالے سے نظام شمسی اور عربوں کھربوں دوسری کہکشاؤں کے حوالوں سے دیکھا جائے تو کائنات لا محدود ہے۔ نہ کوئی اس کا سرا ہے نہ کنارا۔ کائنات ہر چیز پر حاوی ہے۔ لامتناہی مکاں اور لامتناہی زماں پر مشتمل یہ ایک سلسلہ ہے۔ انسانی علم بھی لامتناہے جو کبھی ختم نہیں ہو گا۔ اندر جیت لال رقمطراز ہے: "جدید سائنس کو جو مسئلہ آج در پیش ہے وہ یہ ہے کہ کیا وہ حقیقی طور پر وجود کے اسرار کا پتہ چلا سکتی ہے۔ اگر وہ یہ کام نہیں کر سکتی تو وہ انسانیت کو بہت کم فائدہ پہنچا سکتی ہے۔"[۲۴]

کائنات کے حوالے سے انسان کا علم جتنا بڑھتا جا رہا ہے اس حساب سے کائنات کے حوالے سے کوئی حتمی نظریہ سامنے نہیں آ سکا۔ کائنات کی سادہ تعریف ان الفاظ میں کی جاتی ہے کہ وہ سب کچھ جو موجود ہے وہ کائنات کے زمرے میں آتا ہے۔ بنیادی طور پر دو ہی چیزیں ایک مادہ اور ایک توانائی کے دائرے کو کائنات کہا جاتا ہے۔ عام طور پر کائنات سے مراد اجرام فلکی، ان کے درمیان موجود فضائیں اور موجودہ نظام سے لی جاتی ہے۔ اس نظام کو قدرت نے تخلیق کیا ہے۔ حالانکہ اس نظام کے علاوہ انسانی تجربات، انسانی نظریات اور خود انسان بھی اس زمرے میں آتے ہیں۔

شعیب خالق بذات خود بھی کائنات کی حقیقت کے حوالے سے غور و فکر کرتے ہیں۔ اسی غور و فکر کے زیر اثر ان کا افسانہ " نقطے کا سفر " میں عکاسی کی گئی ہے۔ اس افسانے میں انھوں نے مختلف رنگوں کے ذریعے کائنات اور انسان کی وسعتوں کو ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ کائنات کا ہر رنگ اس کی لا محدود ہونے کی نشانیاں ہیں۔ مصنف مکالماتی انداز میں کائنات کی حقیقت پر سوچتے سوچتے اس منظر پر پہنچ جاتا ہے کہ انسان

اور کائنات کی تخلیق کی اصل وجہ کیا ہے۔ تحریر میں وہ تاثر پیدا کرتا ہے کہ قارئین بھی اس جانب فکر اور شعور سے کام لیں۔ " نقطے کے سفر " کے ذریعے شعیب خالق نے کائنات کی وسعتوں کو ظاہر کیا ہے کہ یہ کائنات بہت وسیع ہے۔ مختلف رنگوں کی طرح یہ کائنات پھیلی ہوئی ہے۔ کہ جدید دور کے اندر جوں جوں انسانی آبادی میں اضافہ ہو رہا ہے یہ کائنات اور وسیع اور پھیلتی جارہی ہے۔ شعیب خالق لکھتے ہیں:

> "لہو میں لاتعداد ذروں کے رنگ سر سے پاؤں تک کے سفر میں تیز رفتاری کے باوجود ذہن میں آکر کسی لمحے کی کمزور کروٹ کا سہارا لیتے ہوئے ٹھہرتے اور سرکتے گئے۔ "(۲۵)

شعیب خالق کی تحریروں میں سائنسی رنگ موجود ہے۔ انھوں نے چند رنگوں کے ذریعے کائنات کو مزین کیا ہے۔ کہیں نیلے رنگ کا ذکر ہے جن کے ذریعے کائنات کی وسعتوں کو ظاہر کیا گیا ہے۔ ہر انسان کے ذہن کے اندر کائنات کی تخلیق اور حقیقت کے حوالے سے مختلف سوالات گردش کرتے ہیں۔ ہر کوئی اس جستجو میں رہتا ہے کہ کائنات کے آغاز اور انجام کے حوالے سے کوئی حتمی نظریہ معلوم ہو سکے۔ لیکن جوں جوں کائنات کی وسعتوں میں اضافہ ہو رہا ہے اس کے حوالے سے سوالات کا دائرہ بھی وسیع ہوتا جارہا ہے۔ شعیب خالق نے تخلیق کار ہونے کے ناطے کائنات کی حقیقت کو تحریری صورت میں پیش کیا ہے:

> "اس نے اپنے پاؤں کو غور سے دیکھا تو آسمان کے رنگ میں سمٹا ہوا ایک ذرہ اس کے اندر ٹھوکریں کھاتا اور پھسلتا پیروں تلے نکلا اور پھر پھیلتے پھیلتے اس کے چاروں جانب سمندر کی طرح ہچکولے لیتا افق عبور کر گیا۔۔ "(۲۶)

انسان بذات خود کو غور کرنے کے ساتھ ساتھ کائنات اور اس کے نظام کے حوالے سے بھی غور و فکر کرتا ہے۔ خود کو غور و فکر کرتے وقت اس اضافے کا مرکزی کردار آسمان کی تخلیق میں گم ہو کر رہ جاتا ہے۔ ایک ذرہ کے برابر جو اب اس کے پیروں سے نکل جاتے ہیں۔ اتنی صدیاں گزارنے کے باوجود بھی انسان آج تک کوئی حتمی نظریہ پیش نہ کر سکا۔ جدید معاشرے کے اندر انسان آج بھی ایک ذرے کے برابر بھی کائنات کی حقیقت کو دریافت نہیں کر سکا۔ ہر کسی نے اپنی سوجھ بوجھ اور ذہنی فقدان کے مطابق یہی نظریات پیش کیے ہیں۔ لیکن جتنی کائنات خود وسیع ہے اور کائنات کی اصل حقیقت ہے اس حوالے سے سمندر کی طرح اصل نتائج اخذ کرنے میں ناقص ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی جدید معاشرے کا فرد اپنے خلاق ذہن سے بہت آگے کی سوچ رکھتا ہے۔

شعیب خالق کے ایک اور افسانے "دوہرا زہر" میں بھی کائنات اور اس کے رازوں کو ایک اور منفرد انداز میں بیان کیا گیا ہے۔اس افسانے میں بتایا گیا ہے کہ کائنات کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے اگر ماضی میں دیکھا جائے تو کائنات ایک لامتناہی چیز ہے اور مستقبل میں دیکھا جائے تو بھی کائنات لامتناہی چیز ہے۔جہاں رُک گئے وہاں سے بھی آگے ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔اس طرح وقت کا بھی نہ کوئی آغاز ہے اور نہ ہی کوئی انجام ہے۔کائنات سے باہر ہونے کا کوئی طریقہ یا راستہ نظر نہیں آتا۔کائنات ہر چیز پر حاوی ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔اس کی صورت لامتناہی زماں اور لامتناہی مکاں کی شکل رکھتی ہے۔اس طرح کائنات کو جاننے کے حوالے سے اگر انسانی سوچ کا جائزہ لیا جائے تو یہ سوچ ایک لامتناہی سلسلہ رکھتی ہے جو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی۔جو نہ ختم ہوتی ہے اور نہ جس کا کوئی عروج نظر آتا ہے۔فرد کا کائنات کے متعلق اور اس کو جاننے کی کوشش بھی ایک ایسا سلسلہ ہے جو ختم ہوتا ہوا نظر نہیں آتا۔انسانی علم اس حوالے سے جتنا ہوتا جائے گا وہ لامختتم رہے گا۔شعیب خالق لکھتے ہیں:

> "لیکن یہ سب کچھ مجھے دوہرے پن کا شکار کرتا جا رہا ہے۔کہاں وہ کائنات کہ جس کی کہکشائیں تمہاری نگاہوں میں روشنی کی دھول کے سوا کچھ بھی نہیں اور۔۔۔کہاں اس دھول کا ایک چھوٹا سا ذرہ کہ جس کی جڑوں سے میری تمام الجھنیں الجھی ہوئی ہیں۔"(۲۷)

شعیب خالق نے کائنات کی حقیقت کی وضاحت کی ہے کہ آسمان پر جو کہکشائیں نظر آ رہی ہیں وہ انسانوں کے لیے محض روشنی کے سوا کچھ نہیں ہے۔انسانوں کے ذہنوں کے اندر ذروں کی مختلف الجھنیں گہری ہوئی ہیں۔نوشیلہ انجم افسانہ "دوہرا زہر" کے حوالے سے لکھتی ہیں:"یہ افسانہ نیم روایتی انداز کا جدید افسانہ ہے جو کہ کردار کی خود کلامی پر مبنی ہے۔اس میں ایک ایسے کردار کا ذکر ہے جس کی شخصیت دو حصّوں میں بٹی ہوئی ہے۔"(۲۸)

افسانہ "دوہرا زہر" میں واحد متکلم کا کردار ایک ایسا کردار ہے جو اس افسانے کا مرکزی کردار ہے۔وہ ایک ہوٹل میں وقت گزارتا ہے۔ایک دن وہ چائے پی رہا ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ والے میز پر بیٹھے دو شخص آپس میں گفتگو کر رہے ہوتے ہیں کہ انسان دنیا میں آتا ہے تو لالچ اور ہوس کا شکار ہو جاتا ہے۔وہی انسان جو کائنات کے ذرے سے بھی آگاہ نہیں وہ پوری زندگی لالچ اور ہوس کا شکار رہتا ہے۔انسانیت کے علاوہ کائنات کی حقیقت پر سیر حاصل گفتگو بھی کرتے ہیں کہ کائنات کا اصل وجود کیا ہے۔اس کے ایک ایک ذرے کی کیا

اہمیت ہے۔اس کی عکاسی شعیب خالق نے یوں کی ہے:

"تم نے یہ احساس ہی اپنے دل سے مٹا ڈالا کہ تمہارا تخم اس کائنات کے ایک گردش زدہ ذرے پر رینگنے والی اس مخلوق میں سے ہے جس کا اپنا وجود اس ذرے کے مقابل کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔"(۲۹)

رینگنے والی مخلوق اس کائنات کے ہر ذرے میں پھیلی ہوئی ہے۔مگر کائنات کے ذرے کے برابر ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔شعیب خالق کے مطابق انسانی وجود سے پہلے اس وسیع کائنات ہی کو تخلیق کیا گیا اور کائنات کے نظام کو بنایا گیا۔انسانی ذات سے زیادہ اس کائنات کی اہمیت ہے۔

کائنات کی حقیقت کے افسانہ "خلیے پر لکھی تحریر" میں کائنات کے حوالے سے بات ہوئی ہے کہ کائنات کے بارے میں مختلف سوالات ہمارے ذہن میں آتے ہیں کہ آسمان جو دکھائی دیتا ہے کیا یہی کائنات ہے؟ یا زمین کا جو حصّہ پھیلا ہوا ہے وہ کائنات ہے۔ایسے ہی سوالوں کی گھمبیر تا کائنات کے حوالے سے ہمیں فکر کے طلسم میں ڈبوے ہوئے ہیں۔کائنات کے آغاز و ارتقاء کے حوالے سے کوئی حتمی نظریہ سامنے نہیں آیا۔حالانکہ کائنات کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔مادہ اور توانائی سے وجود میں آنے والی یہ کائنات ایک وسیع سطح تک پھیلی ہوئی ہے۔زمین کا حصّہ بہت بڑا ہے لیکن ہم جدید معاشرے کے اندر بھی کائنات کی وسعت کا اندازہ لگانے سے قاصر ہیں۔کائنات کی وسعت اتنی پھیلی ہوئی ہے کہ زمین کی حیثیت اس کے مقابلے میں ایک ذرے کے برابر ہے ۔کیونکہ زمین کائنات کا پانچواں بڑا سیارہ ہے جہاں ہم زندگی گزار رہے ہیں۔ایک اندازے کے مطابق کائنات میں تقریباً سو ارب ستارے اور سیارے موجود ہیں اور ہماری زمین ان میں ایک ہے۔کائنات کا ستر فیصد حصّہ جو اندھیرے میں چھپا ہوا ہے۔اتنا عرصہ گزرنے کے باوجود بھی کائنات کی وسعت،کائنات کی عمر اور آغاز وارتقا کے بارے میں کوئی معاون تحقیق ہمارے سامنے نہیں آسکی۔ماہرین فلکیات بھی کائنات میں چھپے پوشیدہ راز کو منظر عام پر لانے سے قاصر ہیں۔ہر زمانے میں اور ہر دور میں کائنات پر تحقیق ہو رہی ہے۔کہا جاتا ہے کہ ابتدا میں کائنات انتہائی گرم تھی اور جگہ بھی انتہائی مختصر اور محدود تھی۔لیکن آہستہ آہستہ کائنات پھیل کر ٹھنڈی ہوئی اور وسیع جگہ گھیرتی رہی۔

نوشیلہ انجم لکھتی ہیں:

"اس افسانے میں مختلف تراکیب کا استعمال کیا گیا ہے۔جیسے گوشت پوستکے،چابی بھرے کھلونے،زمینی کیڑے،ارد گرد چلنے پھرنے والے انسان وغیرہ ایسی تراکیب ہیں جو بہت

ہی دلچسپ اور جدید ہیں"[۳۰]

جدید معاشرے کے اندر کائنات کے آغاز کے سوال نے انسانیت کو کافی عرصہ سے پریشان کیا ہوا ہے۔ وہ کائنات کے آغاز وارتقا کے حوالے سے مسلسل جستجو میں ہے کہ کائنات کا تصور کب معرض وجود میں آیا۔ ایک وقت ایسا تھا جب ہر چیز ایک نقطے میں سمائی ہوئی تھی لیکن پھیلتی ہوئی کائنات کا حجم صفر اور کمیت لامتناہی ہوگئی۔ جدید معاشرے کے اندر فرد ابھی تک کائنات گھمبیر تا میں الجھا ہوا ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار کائنات کے حوالے سے استفہامیہ لہجہ اختیار کرتا ہے۔

افسانہ " خلیے پر لکھی تحریر" میں دیکھا جائے تو فرد کے اندر کی یہ کیفیت ہے کہ جدید معاشرے کے اندر کائنات کے آغاز کے سوال نے فرد کو کافی عرصہ سے پریشان کیا ہوا ہے۔ وہ کائنات کے آغاز وارتقا کے حوالے سے مسلسل جستجو کر کے ان سوالات کے جوابات تلاش کرنا چاہتا ہے

افسانے "خلیے پر لکھی تحریر" میں موضوعات کا تنوع ملتا ہے۔ جہاں اس افسانے میں مختلف موضوعات ہیں وہاں اس افسانے کا موضوع کائنات کی حقیقت کو تلاش کرنا بھی ہے۔ کائنات کی وسعت کے بارے میں مختلف انداز میں دیکھا گیا ہے اور اس کی مختلف شکلوں پر غور کیا گیا ہے۔ افسانے کے مرکزی کردار نے کائنات کے جزوی پہلو پر غور کیا ہے اور کائنات کے بارے میں سائنسی کوشش کو ناکافی قرار دیا گیا ہے۔ کہ آج کے جدید معاشرے کے اندر اگرچہ سائنس کی دریافت نے بہت کچھ بتایا ہے اور کئی رازوں سے پردہ اٹھایا ہے۔ نیز بہت سارے ایسے سوالات جو کائنات کی وسعت کے بارے میں فرد کے ذہن میں وقتاً فوقتاً پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ سائنس نے اس حوالے سے بھی جوابات تلاش کیے ہیں۔ مگر سائنس کی یہ کوشش کائنات کی حقیقت کے انکشاف کے حوالے سے ناکافی ہے۔ شاہد بہت آگے جا کر پتا لگے کہ کائنات کی حقیقت کی تلاش میں کس قدر کامیابی ملی ہے۔ شعیب خالق اپنے افسانے خلیے پر لکھی تحریر میں لکھتے ہیں:

> "کائنات کی گھمبیر تا بھی بڑی عجیب سی نہیں عجیب تر بھی ہے اور ہم لوگوں کے لیے غریبی کا باعث بھی۔ میں نے کہا تھا کہ سائنس بڑی سست رفتاری سے چل رہی ہے۔ شاہد کہیں بہت آگے چل کر پتہ چلے کہ یہ سب تو ایک تجربہ تھا۔ کائنات میں کہیں تالیاں بجیں اور آواز ابھرے۔ شاباش تم اپنے واپسی کے سفر میں کامیاب ہوئے۔ آو اب ایک کائنات کی تلاش میں ہماری واپسی کے سفر کو اپنی جستجو بناؤ۔"[۳۱]

شعیب خالق کے اس افسانے میں کائنات کے پھیلاؤ اور اس کی محدودیت کے بارے میں واضح ہوتا

ہے کہ کائنات اس قدر وسیع ہے کہ جدید معاشرے کے اندر انسان نے چاند پر قدم رکھ لیا ہے مگر اس کے باوجود بھی کائنات کو پوری طرح سمجھنا انسان کے بس کی بات نہیں۔کائنات کی عمر کے متعلق ابھی بہت سارے سوالوں کے جوابات تلاش کرنا ضروری ہیں۔سائنس کے ذریعے اس کی کوشش مسلسل ہو رہی ہے۔لیکن سائنس سے کی گئی کوشش کائنات کے حوالے سے محض جزوی باتوں کو سامنے لاتی ہے۔لیکن کلی حوالے سے شاہد سائنسی تحقیق بڑی سست رفتاری سے چل رہی ہے۔ایسا لگ رہا ہے کہ کائنات کے بارے میں چند سوالات کے جوابات حاصل کرنے کے بعد پتہ لگے کہ اب ایک اور کائنات کی حقیقت کی تلاش کرنی ہے۔اس افسانے میں واحد متکلم کا مرکزی کردار کائنات کے لامحدود تصور کو سامنے لاتا ہے اور یہ باور کروانے کی کوشش کرتا ہے کہ جدید معاشرے کے اندر فرد اس بات کا تجسس کرتا ہے کہ آخر وہ کب کائنات کو پوری طرح سمجھنے کے قابل ہو جائے گا۔آج سائنس ترقی کی منزل کو چھو رہی ہے مگر فرد کے سوالات کے جوابات دینے میں ناکام ہے۔

شعیب خالق نے جدید معاشرے کے افراد کے داخلی مسائل پر قلم اٹھا کر ان کی سوچ، سوالات اور داخلی مسائل کو اجاگر کیا ہے اور واضح طور پر بتایا ہے کہ جدید معاشرے کا فرد آج بھی کائنات کے بارے میں سوچتا ہے۔وہ کائنات کو جاننا چاہتا ہے۔اس کی خواہشات کائنات کی معلومات پر تحقیق کرنا ہے۔اس مقصد کے لیے وہ آج بھی جستجو کر رہا ہے۔اسے بہت سارے سوالات کا جواب جاننے کے باوجود ابھی تک کائنات کے بارے میں مختلف جوابات مطلوب ہیں۔شعیب خالق نے اپنی تحریروں میں کائنات کی حقیقت کو رچا بسا کر ایک نئے رنگ میں پیش کیا ہے۔جدید روش کو اپناتے ہوئے کائنات کی حقیقت کو نئے خیالات کی صورت میں پیش کیا ہے۔نوشیلہ انجم لکھتی ہیں:"اس افسانے میں ہزاروں سال پہلے کی تاریخ دوہرائی گئی ہے۔۔۔افسانے میں دو کردار ہیں جو سائنسی ترقی اور جدید زندگی پر بحث کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔"(۳۲)

شعیب خالق نے اپنے ایک اور افسانے "وائجر ٹو" میں منفرد انداز میں کائنات کی حقیقت کے خارجی پہلو کا انسانی ذہن اور زندگی پر اثرات کو موضوع بنایا ہے۔شعیب خالق نے دوسرے ادیبوں کی طرح محض کائنات کی خارجی الجھنوں اور مسائل کے بیان پر اکتفا نہیں کیا۔بلکہ کائنات کی حقیقت کے تمام مسائل کو دریافت کرتے ہوئے انسانی ذہن پر اس کے اثرات کا جائزہ لیا ہے۔

شعیب خالق لکھتے ہیں:

"ہمارا حاصل فقط یہ عمر یہ زندگی یہ خلا اور کائنات جو ہمیں دکھائی اور سمجھائی دیتی

ہیں۔ جانتے ہو، وائجر ٹو سورجی حصار باہر نکل رہا ہے۔ شعوری زندگی کے ہاتھوں کا بنایا ہوا کھلونا۔ بغیر انسانی زندگی کے کئی سالوں سے خلائیں تیرتا ہوا زمین سے دور ہوتا چلا گیا۔ "(۳۳)

اس افسانے میں مصنف منفرد انداز میں کائنات کے حوالے سے سوال اٹھاتا ہے کہ لوگوں کے مطابق جو یہ عمر، ظاہری زندگی، سورج، چاند، ستارے جو ہم روز زندگی میں دیکھتے ہیں یہی کائنات ہے مگر حقیقت میں اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے جس کو سمجھنے کے لیے غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے۔

شعیب خالق نے اپنے افسانے "بے حرف لفظ" میں کائنات کی حقیقت کے ساتھ ساتھ اس حوالے سے بھی روشنی ڈالی ہے کہ ہماری زندگی کا مقصد عمر اور زندگی کے ساتھ رہ گیا ہے۔ کائنات کا وہ تصور جو ماہرین نے ہمارے سامنے پیش کیا ہے اس ہی کو ہم کائنات سمجھ لیتے ہیں۔ یہ ایسی کی بات ہے کہ کائنات کی حقیقت کے حوالے سے کوئی بھی غور و فکر نہیں کرتا اور نہ ہی کائنات کی حقیقت کو جاننے کے لیے جدید معاشرے کے افراد جستجو کرتے ہیں۔ انسان دنیا میں آکر صرف اپنی عمر گزار کر چلا جاتے ہیں۔ غور و فکر اور جستجو کی طرف مائل نہیں ہوتے۔ ایسے ہی لوگ معاشرتی خرابیوں کے بھی ذمہ دار ہیں۔

خوف:

شعیب خالق نے اپنے افسانے "ڈور" میں یہ واضح کیا ہے کہ جدید معاشرے کے داخلی مسائل میں سے ایک اہم مسئلہ خوف بھی ہے۔ اس سے افراد کے مسائل میں اضافہ ہو رہا ہے۔ خوف ایک نفسیاتی مسئلہ ہے۔ یہ انسانوں میں اس وقت پیدا ہوتا ہے جب وہ کسی مشکل اور خطرے کا شکار ہوں۔ اس کا ردعمل اگر دیکھا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ خوف میں مبتلا شخص خطرے یا فرار سے خود کو چھپانے کی خواہش کرتا ہے۔ وہ اس خطرے سے بچنا چاہتا ہے اور اپنے بچاؤ کے لیے مختلف حربے وقتاً فوقتاً استعمال کرتا رہتا ہے۔ جب وہ ایسا کرتا تو اسے متعدد نفسیاتی مسائل کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بعض اوقات وہ نفسیاتی امراض کا بھی شکار ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں وہ مستقبل کی تشویش اور ماضی جیسی تقصیر صورتحال میں مبتلا رہتا ہے۔

ایک شخص جب خوف کی کیفیت سے دوچار ہوتا ہے تو اسے معلوم نہیں ہو رہا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ یہ خوف بہت سی مختلف صورتوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ کچھ لوگوں کو نگلنے میں خوف محسوس ہوتا ہے، کچھ افراد ہر وقت اور ہمیشہ اداسی اور پریشانی کی باتیں کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ غیر معمولی بات کو محسوس کر کے ڈر اور خوف کا شکار رہتے ہیں۔ کچھ ماضی میں گزرے ہوئے لمحات کے بارے میں سوچ سوچ

کے خوف میں مبتلا رہتے ہیں اور اسی خوف سے آنے والی زندگی میں بھی چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتے۔

بعض اوقات ایک خوشی حاصل کرنے کے لیے ایک جواز ہمارے سامنے ہوتا ہے۔ لیکن اس جواز کو سامنے رکھ کر خوشی حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ بعض اوقات وہ سب دکھ کی شکل اختیار کر جاتا ہے۔ کچھ افراد اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے بعض چیزوں پر توقعات لگالیتے ہیں۔ اگر وہ پوری ہو جائیں تو ان کی دلی اور دماغی کیفیت پر سکون ہو جاتی ہے۔ لیکن توقعات کے بر عکس رد عمل آئے اور توقعات پوری نہ ہو رہی ہوں تو توقعات ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رجاتی ہیں۔ اس وقت فرد کے اندر افسردگی، مایوسی اور بیزاری اس کے داخل میں اثر انداز ہونا شروع ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے فرد کسی بھی کام میں دلچسپی لیتا ہوا نظر نہیں آتا۔ شعیب خالق لکھتے ہیں:

"چھولوں گا، کبھی نہ کبھی، جہاں گزرے ہوئے لاکھوں اندھیر سالوں نے اس خواب میں احساساتی رنگوں سے تصویریں بنائی ہیں تو کہیں آنے والے ہزاروں روشن سال ان تصویروں کی دنیا ہوں گئے۔"(۳۴)

بعض افراد کے اندر دیکھا گیا ہے کہ وہ معاشرتی زندگی میں بہت زیادہ فکر مند رہتے ہیں۔ فکر مند رہنے کی وجہ سے بھی انسان خوف کا شکار رہتا ہے۔ خوف اور اندیشے کی وجہ سے وہ پریشانی کی کیفیت میں نظر آتا ہے۔ یہ خوف حد سے بڑھ کر اس کی شخصیت کو داخلی طور پر توڑ پھوڑ دیتا ہے۔ اس طرح کے افراد معاشرے میں مس فٹ نظر آتے ہیں۔ ایسے افراد جب کسی چھوٹے مسئلے کو دیکھتے ہیں تو ان کی داخلی کیفیت کی وجہ سے یہ مسئلہ بڑا الجھا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ان کی سوچ کا دائرہ بھی محدود ہوتا ہے۔ جب وہ بار بار مسلسل ایک ہی بات کو سوچتے ہیں اس سے وہ سوچ اور خیال پہلے سے زیادہ جستگی اختیار کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر کے پاس جانے کا خوف، شرم کا خوف، بند جگہ کا خوف، روشنی کا خوف یہ خوف کی ایسی اقسام ہیں جو جدید معاشرے کے اندر لاشعوری طور پر فرد کو در پیش ہیں

اس افسانے میں ایک اور پہلو بھی ہے کہ عموماً انسان ایک بہادر مخلوق ہے۔ اسے تمام مخلوقات پر اشرف المخلوقات ہونے کے ناطے برتری حاصل ہے۔ اس کے اندر لاشعوری خواہش اس قدر سرائیت کر گئی ہے کہ وہ نا چاہتے ہوئے بھی لاشعوری طور پر خوف اور ڈر کا شکار نظر آتا ہے۔ بعض خواہشوں کی تکمیل ہوتی ہوئی نظر نہیں آتی تو وہ بار بار ذہن میں دوہرائی جاتی ہے۔ بار بار ذہن میں آنے کی وجہ سے وہ حقیقت کا روپ اختیار کر لیتی ہیں اور نفسیاتی مسائل کا شکار بھی اس وجہ سے ممکن ہوتا ہے۔ نفسیاتی مسائل سے بہت ساری

مشکلات آتی ہیں جن کی بدولت مشکلات کم ہونے کی بجائے بڑھ جاتی ہیں۔ابوالاعجاز صدیقی نفسیات کے حوالے سے رقمطراز ہیں:"نفسیات ایسا علم ہے جو فرد کے کردار کا سائنسی مطالعہ اس کے ماحول میں کرے۔"(۳۵)

نفسیات کی جدید تحقیق کو بھی اگر سامنے رکھا جائے تو ذہن کی سوچ کو اہمیت حاصل ہے۔ذہن کی سوچ اپنا راستہ خود تلاش کرتی ہے۔یہ سوچ جیسے ہوگئی ویسے ہی حقیقت کی شکل میں سامنے آئے گئی۔یہ مسائل خارجی نہیں بلکہ داخلی شکل رکھتے ہیں جو ذہنی اختراع کا نتیجہ ہے۔شعیب خالق کا یہ افسانہ خوف کی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے۔اس افسانے میں واحد متکلم کے مرکزی کردار کے ذریعے معاشرے میں چہروں کے ذریعے پیدا ہونے والی بے یقینی اور خوف کو بیان کیا گیا ہے۔انسان بعض اوقات داخلی کیفیات کے ذریعے خوف کو محسوس کرتے ہیں۔اس کی عکاسی شعیب خالق نے بھی کی ہے:

"ہاں میرا ہدف وہ ڈور ہے جو دماغ کے پنے سے نکل رہی ہے،جانتے ہو جب اس پنے کی ڈور کے گنجل ٹوٹتے تھے تو نام نہاد معتبر لوگ اپنا اپنا سرا لیے ایک دوسرے کی مخالف سمت میں اس گولے کے گرد ایسے چکر کاٹنے لگے تھے کہ ساری زمین ڈور کے بنائے ہوئے مختلف خانوں میں بٹ گئی تھی۔۔۔ مگر اب ان سانسوں سے چھٹکارا پانا چاہتا ہوں یا بہت آگے یا بہت پیچھے رہنا چاہتا ہوں۔"(۳۶)

شعیب خالق نے انسان کی داخلی کیفیت کی عکاسی کی ہے۔انسان خوف کے ذریعے داخلی کرب کا شکار ہو جاتا ہے۔حالات واقعات کو پیش نظر رکھتے ہوئے انسان کی نفسیاتی الجھنوں کی وجہ سے خوف کی کیفیت کو بیان کیا ہے۔خوف ایک ایسی چیز ہے جو فرد کو اپنے ہی ماحول کے اندر تنہا کر دیتا ہے۔خوف تمام تر سماجی پریشانیوں اور الجھنوں کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔

جدید معاشرے کے اندر حالات و اقعات میں جس قدر تیزی آرہی ہے اس کی وجہ سے فرد ایک دوسرے سے بہت قریب رہتے ہوئے بھی انجان ہوتے جارہے ہیں۔ایک دوسرے کے لیے انجان اور دوری کے باعث تنہائی بہت زیادہ ہوگئی ہے۔تنہائی بہت زیادہ خوف پیدا کرنے کا باعث بنتی ہے۔کیونکہ انسان جب اکیلا ہوتا ہے تو بہت سی چیزوں کو تخیلاتی دنیا میں سوچ لیتا ہے۔تخیلاتی دنیا میں گم ہو جانے کے بعد بہت ساری باتوں کو فرض کر لیا جاتا ہے۔جس کی وجہ سے انسان اندر ہی اندر خوف سے دوچار ہو جاتا ہے۔بعض اوقات سماجی اور معاشرتی جبر بھی خوف میں اضافے کا باعث بنتا ہے اور یہی خوف نفسیاتی امراض کا موجب بنتا

ہے۔نفسیاتی امراض کا شکار اور وہم میں مبتلا رہنے کی وجہ سے اس بیماری کا شکار ہوتا ہے۔ذہنی خلل، بے چینی، خوف واضطراب کی وجہ سے افراد نفسیاتی خوف کا شکار ہو جاتے ہیں۔خوف کی یہ کیفیت ایک ذہنی بیماری پیدا کرنے کا موجب بنتی ہے۔ہر وقت نفسیاتی خوف کے شکار مریض اس کشمکش میں رہتے ہیں کہ انھیں کچھ ہونے والا ہے حالانکہ یہ صرف ایک دماغی خلل ہوتا ہے۔خوف معاشرتی دباؤ، اخلاقی پستی اور جنسی شعور کی ناپختگی کے باعث پیدا ہوتا ہے۔ان تمام عوامل کا اس کی نفسیات پر اثر دکھایا گیا ہے۔

شعیب خالق نے معاشرے کی عکاسی کرتے ہوئے بچوں اور معاشرے کے دیگر افراد کی نفسیاتی کیفیات کی عکاسی ان کے ماحول کے حوالے سے کی ہے۔انھوں نے خوف کے حوالے سے جس طرح مردانہ کرداروں کا تجزیہ پیش کیا ہے اس طرح کسی اور کے ہاں نہیں ملتا۔قمر رئیس رقمطراز ہیں:"فرائیڈ کہتا ہے کہ ہمارا یہ فعل جنسی تحریک سے ہوتا ہے مگر میں نے یہ ظاہر کیا کہ جنس اپنی جگہ ہے مگر ماحول کا اثر بہت زیادہ ہوتا ہے۔"(۳۷)

شعیب خالق نے اپنے افسانہ "چھتری نما کہانیاں" میں مردانہ کردار کے ذریعے انسانی نفسیات کی عکاسی بہت خوبصورت انداز میں کی ہے۔خوف کے نکلنے کی طرف توجہ مبذول کروائی ہے کہ فرد کی شخصیت کی تعمیر و تخریب میں معاشرے اور ماحول کا اثر بہت گہرا اور واضح ہوتا ہے۔اس کی مثال انھوں نے "یوسف" کے کردار کے ذریعے پیش کی۔"یوسف" جو معصوم بچہ ہے جو مردوں کی نظروں میں ہے۔"سمندرا" ان مردانہ نظروں سے اسے بچانے کی بہت کوشش کرتا ہے۔"سمندرے" کا دوست "دادا" مرتے وقت اس کو نصیحت کر گیا تھا کہ وہ اس کے بیٹے کا خیال رکھے اور تانگہ بانوں سے بچا کر رکھے۔"سمندرا" روزانہ "یوسف" کو سکول چھوڑنے جاتا ہے اور روزانہ واپس گھر پر بحفاظت چھوڑ جاتا ہے تانگہ بانوں میں "ملکی"، "فیاضا"، اور اس طرح "حنیفا"، "سمندرے" سے اصرار کرتے ہیں کہ وہ "یوسف" کو کبھی احاطے میں لے کر آئے۔"سمندرا "خوف کا شکار ہے۔اسے ڈر ہے کہ اگر وہ "یوسف" کو احاطے میں لیے گیا تو تانگہ بانوں کے اس گروپ میں "یوسف" کو جنسی تشدد کا نشانہ نہ بنا لیا جائے۔وہ اپنے دوست "دادا" کی نشانی کی حفاظت کرنا چاہتا تھا۔اس لیے وہ "یوسف" کو سکول سے سیدھا گھر چھوڑ کر آتا ہے۔

"یوسف"، "دادا" کا بیٹا ہے جو بچپن سے خوبصورت تھا۔تانگہ بانوں کی نظر میں آنے کی وجہ سے تانگہ بان اس موقع کی تلاش میں رہتے کہ وہ موقع پا کر "یوسف" کو جنسی تشدد کا نشانہ بنا کر اپنی ہوس پوری کریں۔"سمندرے" نے اپنے دوست کے بیٹے "یوسف" کو ان سے بچانے کی ٹھان لی تھی۔وہ اس کی حفاظت

کرتا ہے۔ مگر اس کو اندر ہی اندر ایک خوف روز بروز کھائے جارہا تھا کہ "ملکی"، "فیاضا" اور "حنیفا" اس کی جان کے دشمن ہو گئے ہیں۔ وہ بوڑھا ہو رہا ہے۔ ایسے میں اگر اس کو کچھ ہو گیا تو "یوسف" کو ان درندوں کی درندگی سے کون بچائے گا۔ اس چیز نے اسے داخلی طور پر کمزور کر دیا تھا۔ اسے تانگہ بانوں کی طرف سے طرح طرح کی باتیں سننے کو ملا کرتیں۔ اس کی پریشانی اور اندر کا ڈر وقت کے ساتھ بڑھ رہا تھا۔ شعیب خالق لکھتے ہیں:

"سمندرا آہستہ آہستہ دادا کی موت کے بعد واپس اپنی حیثیت میں لوٹتا چلا آرہا تھا۔ مگر اب اس پر دن رات ایک بھیانک خوف طاری رہتا۔ احاطے اور محلے کے کئی شکروں سے یوسف کو بچا رکھنے کی ڈوٹی اس جیسے کمزور وناتواں کوچوان کے لیے بہت بھاری ذمہ داری تھی۔ چند نئے تانگہ بانوں کی بے صبری زبانوں نے ایک دن کھلے عام یوسف کو سمندرے کا "مندرجہ ذیل" کہا اور پھر یوسف کی جگہ یہی لفظ اور لوگ بھی استعمال کرنے لگے۔"(۳۸)

جب ذمہ داری گلے پڑ جاتی ہے تو اس کے بعد اس کو پورا کرنا کس قدر مشکل ترین مرحلہ ہوتا ہے۔ "یوسف" خوبصورت لڑکا تھا۔ جوں جوں اس کی عمر بڑھتی گئی اس کے حسن میں اضافہ ہوتا گیا۔ "یوسف کے والد" "دادا" کے مرنے کے بعد جب اس کی ذمہ داری "سمندرے" پر آئی تو اس ذمہ داری نے اس کو داخلی طور پر کمزور کر دیا۔ وہ ہر وقت خوف اور ڈر جیسی کیفیت میں مبتلا رہنے لگا۔ "ملکی"، "فیاضا" اور "حنیفا" اس کو جان سے مارنے کی دھمکیاں دیتے۔ وہ "یوسف" سے جنسی تشدد کرنا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے کئی بار "سمندرے" کو کہا کہ وہ "یوسف" کو تانگہ بانوں کے احاطے میں لائے۔ جب "سمندرا" ان کی بات نہیں مانتا تھا تو وہ اس کو جان سے مارنے کی دھمکیاں دیتے۔ "یوسف" کی ذمہ داری اور تانگہ بانوں کی دھمکیوں نے "سمندرے" کو داخلی طور پر خوف اور ڈر میں مبتلا کر دیا۔ اس کے ذہن میں ہر وقت خوف اور ڈر رہتا کہ "ملکی"، "فیاضا" اور "حنیفا" کسی بھی وقت "یوسف" اور اس کے ساتھ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔

اس ضمن میں یاسمین فاطمہ لکھتی ہیں:

"آج کا انسان نام کا خول اپنے اوپر چڑھائے دوسروں میں امتیاز حاصل کرتا ہے۔ نام کے خول کے اندر دھڑکتا گوداوہ خواہشات ہیں۔ جن کی کوئی انتہا نہیں۔ لیکن ہر نام والی چیزوں کے ساتھ ہزار پایہ موت بھی ہوتی ہے جو ہر چیز کا انجام ہے۔ وجود کی اس بدنیتی کو ایکس رے رپورٹ سے ظاہر کیا گیا ہے، انسان ہڈیوں کے ڈھانچے کے سوا کچھ

اور نہیں ہے۔اور موت ایک اٹل حقیقت ہے جو ہر چیز کا اولین اورواحد مفہوم ہے۔"(۳۹)

خوف کی وجہ سے اس نے"یوسف"کو احاطے میں لاناترک کر دیا تھا۔اسے ڈر تھا کہ تانگہ بان"یوسف"کو جنسی تشدد کا نشانہ نہ بنالیں۔

"اس دن کے بعد اس نے یوسف کو احاطے کے اندر لاناترک کر دیا تھا۔ پچھلے چند دنوں سے وہ یوسف کو سالم تانگے پر سکول چھوڑتا اور واپسی پر بھی سکول سے سیدھا گھر کی گلی کے سامنے اتارتا۔جب تک یوسف گلی میں گھر کے اندر داخل نہ ہوتا سمندرا وہیں تانگے پر کھڑے کھڑے گلی میں آتے جاتے لوگوں کو ایک بھوں اٹھا کر مشکوک نگاہوں سے دیکھتا رہتا۔ مگر احاطے کے اندر سمندرے کی ایک بھوں اٹھی آنکھ صرف زمین کو گھور سکتی تھی۔ نظریں اٹھا کر وہ کچھ دیر تانگہ بانوں کی بمشکل لمحوں تک سہمی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ دیکھنے کی ہمت تو رکھتا لیکن آج اسے بھاگنے کا موقع بھی نہیں دیا جارہا تھا۔"(۴۰)

"سمندرے"کو داخلی سطح پر کس قدر خوف تھا۔تانگہبان"یوسف"کی ایک جھلک کو ترسنے لگے۔"سمندرا"،"یوسف"کی حفاظت کرناچاہتا تھا۔تانگہ بان اور دیگر محلے کے اوباش ہر وقت موقع کی تلاش میں رہتے کہ کب ان کے ہاتھ "یوسف" آئے اور وہ اسے اپنی ہوس کا نشانہ بنائیں۔"ملکی"،"فیاضا"اور"حنیفا "اس مقصد کے لیے خاص طور پر متحرک تھے۔"سمندرا"حالات سے باخبر تھا۔اس کا جسم وقت کے ساتھ ساتھ کمزور ہو رہا تھا۔وہ جانتا تھا کہ وہ اوباش اور آوارہ لوگوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ لیکن اس کے باوجود اس سے جو ہو سکا اس نے کیا۔جب حالات زیادہ خراب ہوئے تو وہ ذہنی طور پر خوف میں مبتلا ہو گیا۔بے بسی اور خوف کے باوجود اس نے یوسف کو گھر کے دروازے سے لے کر گیٹ تک لانے جانے کی ذمہ داری اٹھائی۔وہ کسی بھی ممکنہ خطرے سے آگاہ تھا۔اس مقصد کے لیے اس نے"یوسف"پر کڑی نگرانی شروع کر دی۔"سمندرے"کی روزی کا دارومدار سواریوں سے وصول کردہ کرایہ تھا۔خوف اور ڈر کی کیفیت کی وجہ سے اس کی معاشی مشکلات میں بھی اضافہ ہوا۔اس سے اس کی پریشانی وقت کے ساتھ ساتھ اور بھی بڑھ گئی۔

"اگلی صبح یوسف کو گھر سے اٹھایا تو سکول پہنچنے تک "سمندرے"نے اس کی کسی بات کا جواب نہیں دیا۔وہ تو سارا راستہ گھبرائے انداز دائیں بائیں خائف نظریں دوڑاتا اور

آگے پیچھے دیکھتا جارہا تھا۔ واپسی پر اس کا دل چاہا وہ باہر اڈے سے ہی سواری اٹھائے اور دیہاڑی لگائے۔ لیکن اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ ملکی جیسے بد معاشوں سے دشمنی بنائے۔"(۴۱)

ڈر اور خوف گہرے اثرات مرتب کرتے ہیں۔"سمندرے"کی روزی کا انحصار دن بھر سواریاں تانگے میں بیٹھا کر ان سے لینے والا کرایہ تھا۔ وہ ان سواریوں سے کرایہ اکھٹا کر کے اپنے گھر کا چولہا جلاتا تھا۔ جب"ملکی"،"فیاضے"اور"حنیفے"نے"یوسف"کے سلسلے میں اس کو تنگ کرنا شروع کیا تو اس نے ان کے ڈر کی وجہ سے تانگہ بانوں کے احاطے میں جانا چھوڑ دیا۔ اس وجہ سے اسے گھریلو مشکلات پیش آئیں۔ اس کی بیوی اس سے اکثر گھریلو اخراجات کے حوالے سے شکایت کرتی۔ وہ اپنے دکھ اور پریشانی کو کسی کے سامنے بھی بیان نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ اکثر تانگہ بان اس کو"یوسف"کا"مندرجہ ذیل"سمجھتے تھے۔ اس نے کئی بار لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کی کہ"یوسف"اس کا"مندرجہ ذیل"نہیں بلکہ اس کے بیٹوں کی طرح ہے۔ اس ساری صورتحال نے اس کو داخلی سطح پر اس قدر متاثر کیا کہ وہ ہر وقت ڈر اور خوف جیسی کیفیت میں رہنے لگا۔ اس کی پریشانی کم ہونے کی بجائے دن بدن بڑھنے لگی۔

"یوسف"وقت کے ساتھ ساتھ بڑا ہوتا گیا۔ اس کی جوانی اور خوبصورتی جب تانگہ بان نالخصوص "ملکی"،"فیاضے"اور"حنیفے"نے دیکھی تو وہ اس پر فریفتہ ہو گئے۔ ہر وقت ان کے ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ کوئی موقع ہاتھ آئے اور وہ"یوسف"کو حاصل کر لیں۔ وہ موقع کی تلاش میں مارے مارے پھرتے۔ اس سے"سمندرا"ہر وقت خوف اور ڈر کی کیفیت میں رہنے لگا۔

"اگلے پھیرے کے لیے وہ احاطہ میں واپس نہ آیا اور باہر جی ٹی روڈ سے ہی سواریاں اٹھا کر دیہاڑی لگائی۔ ہر پھیرے کے دوران کوئی خوف جیسے باگیں کھینچ کر گھوڑا تیز دوڑا دیتا اور پھر گھوڑے کو قابو میں رکھنا سمندرے کو ڈرا دیتا۔ اسے کئی بار اس خیال نے لرزایا جیسے وہ یوسف کو اغوا کر لیں گئے۔ سکول میں چھٹی کی گھنٹی بجی تو اسے دھیان آیا کہ وہ کوئی گھنٹہ بھر پہلے سکول آ گیا تھا۔"(۴۲)

"سمندرے"کی داخلی کیفیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔"یوسف"کی حفاظت کا ذمہ جب سے اس نے اپنے ذمے لیا تھا اس وقت سے اس کی زندگی کا سکون ختم ہو گیا تھا۔ دن کا پتا ہی نہیں لگتا کہ کب شروع ہوتا اور کب ختم ہوتا۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ خوف میں مبتلا ہو گیا۔ اس وجہ سے اکثر وہ سکول کے گیٹ کے باہر اکثر

جلدی یوسف کو لینے پہنچ جاتا اور سکول کے پاس پہنچ کر اسے اندازہ ہوتا کہ وہ ٹائم سے قبل ہی آگیا ہے۔ اس کا دھیان اپنی دیہاڑی پر کم ہی لگتا۔ بلکہ اسے اپنے گھر والوں سے بھی سے زیادہ "یوسف" کی حفاظت کی فکر ہو گئی۔ خوف اور ڈر کی کیفیت میں وہ احاطے نہ جاتا بلکہ جی ٹی روڈ سے ہی اگر سواریاں مل جائیں تو ان کے کرایہ سے ہی اپنا گزارا چلاتا۔ اس وجہ سے اس کی مشکلات میں اضافہ ہو گیا۔ "حنیفا"، "ملکی" اور "فیاضا" حد سے زیادہ جب "یوسف" میں دلچسپی لینے لگے تو اس سے "سمندرے" کے مسائل میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ یہ سب "سمندرے" کو جان سے مار دینے دھمکیاں دیتے اور اس سے اصرار کرتے کہ وہ "یوسف" کو تانگہ بانوں کے احاطے میں لے آئے۔ اس سے "سمندرا" ہر وقت "فیاضے، "حنیفے" اور "ملکی" سے ڈرتا رہتا:

> "گلی سے باہر تانگہ رکا تو آج وہ اسے گھر کے دروازے تک خود چھوڑنے آیا۔ یوسف گھر میں داخل ہوا تو جیسے سمندرے کے سر سے منوں بوجھ اتر گیا۔ گلی سے باہر کچھ لوگوں نے سالم تانگہ لیا مگر سارا راستہ وہ ملکی اور فیاضے کا ردعمل سوچتا اور ہر بار آخر میں جیسے دادؤ کی روح کو مسکراتے ہوئے کہتا۔ اوے یار زیادہ سے زیادہ کیا کریں گئے ہیں ماریں گئے، ماریں۔ "(۴۳)

"سمندرے" کا دوست "دادا"، "سمندرے" کو اپنے بیٹے کی ذمہ داری دے کر جب دنیا سے چلا گیا تو اس کے باوجود بھی "سمندرے" کو ایسا لگتا کہ جیسے "دادا" کی روح اس کو ہر وقت دیکھ رہی ہو۔ جب "ملکی" اور "فیاضے" نے "سمندرے" کو تنگ کیا تو "سمندرا" ان کے ہر ظلم کو سینے پہ سہ جاتا ہے۔ اس نے "یوسف" کی حفاظت کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا ہے۔ جب وہ ایسا کرتا تو اسے ایسا لگتا جیسے "دادا" کی روح اس کے سامنے آجاتی اور اس کا شکریہ ادا کرتی۔ اس سے "سمندرے" کا خوف اور ڈر کی کیفیت قدرے کم ہو جاتی اور وہ اپنے آپ کو تسلی دینے کے لیے، خوف اور ڈر کم کرنے کے لیے اکثر یہی کہتا کہ زیادہ سے زیادہ اس کی جان ہی جائے گئی۔ جان جائے لیکن یوسف پر آنچ نہ آئے۔

> "ایک بھیانک خوف نے اس کے سارے وجود کو اپنی گرفت میں جکڑ رکھا تھا۔ جسم میں کپکپاہٹ اور دانت آپس میں بج رہے تھے۔ سارا ہجوم خاموشی سے احاطے میں کھیلا جانے والا ڈرامہ دیکھ رہا تھا۔ سمندرے نے ہاتھ جوڑ کر تمام لوگوں کو ہچکیاں بھرتے ہوئے کہا۔ اوے پنج تن پاک کا واسطہ ہے ایسے نہ کہو، اوے اللہ نبی کی قسمیں یوسف میرا مندرجہ ذیل نہیں۔ "(۴۴)

"سمندرے" کو کافی مشکلات تھیں۔"سمندرے" کے جسم میں خوف اور ڈر کی وجہ سے کپکپاہٹ کی کیفیت تھی۔اس کے دانت بھی آپس میں بجتے رہتے۔جب اس کے یقین دلوانے کے باوجود کسی نے اس پر بھروسہ نہیں کیا تو وہ بے بسی کی کیفیت میں سب لوگوں کو پنج تن پاک کا واسطہ دیتا ہے اور ہجوم میں سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "یوسف" سے اس کا تعلق بیٹوں جیسا ہے۔کوئی فرد بھی "یوسف" کو اس کا "مندرجہ ذیل" نہ سمجھے۔اس نے جب رُورُو کر اور واسطے دے دے کر لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کی تو بات سمجھنے کی بجائے انھوں نے اس کو اور تنگ کرنا شروع کر دیا۔اس سے وہ ہر وقت خوف اور ڈر جیسی کیفیت میں رہنے لگا۔

شعیب خالق کا افسانہ "بے حیرانگی" بھی ایک ایسا افسانہ ہے جس میں شعیب خالق نے مشرقی تہذیب کے اندر فرد کے داخلی خوف کی عکاسی کی ہے۔اس میں خاص طور پر مرد اور اس کے نفسیاتی مسائل اور اس کی الجھنوں کو موضوع بنایا ہے۔شعیب خالق نے مشرقی معاشرے کی عکاسی محض خارجی عوامل کی پیش کش تک محدود نہیں کی بلکہ فرد کے داخلی خیالات اور محسوسات کو بیان کیا ہے۔شعیب خالق نے اس افسانے میں ایک پروفیسر کے مرکزی کردار کے ذریعے ایک ایسے فرد کی عکاسی کی ہے جو معاشرتی رویوں سے تھک کر خوف اور ڈر کا شکار ہو جاتا ہے۔اسے اس معاشرے کے اصول و قوانین نے بزدل بنا دیا ہے۔شعیب خالق نے واحد متکلم "بیٹے" کے کردار کی صورت میں ایک مضبوط مرد کا تصور دیا ہے جو سماجی دباؤ برداشت کرنے کے باوجود بھی اپنے باپ کو خوف سے نجات دلانے کی کوشش کرتا ہے۔ناپختگی، معاشرتی دباؤ اور اخلاقی پستی تمام عوامل باپ کی نفسیات پر اثر انداز ہوتے ہیں۔اس افسانے میں کردار کے حالات واقعات کو پیش نظر رکھتے ہوئے خوف کو موضوع بنایا ہے۔وہ نفسیاتی دباؤ کا شکار ہو کر دنیا سے بیزار ہو جاتا ہے اور اپنی ایک الگ تخیلاتی دنیا بنا لیتا ہے۔صفیہ عباد رقمطراز ہیں:

> "عدم تحفظ کی یہ صورتحال فرد کو اس کی ذات کے اندر ہی سمیٹنے لگتی ہے۔خارجی ماحول کی بے اعتدالی اور ناہمواری اس کے اندر اس کی اپنی ہی ذات کو ایک پناہ گاہ بنا دیتی ہے۔لیکن اس پناہ گاہ میں بھی اسے یہی احساس شدت سے دامن گیر ہے کہ وہ محفوظ نہیں۔"(۴۵)

افسانہ "بے حیرانگی" کا مرکزی کردار ایک تاریخ کا پروفیسر تھا۔وہ اپنے حال کی نسبت ماضی کو بہتر گردانتا تھا۔وہ سمجھتا تھا کہ آزاد خیالی قدیم دور میں سائنس کو تصور کیا جاتا تھا۔تاریخ کے اندر ایسے لوگ تھے

جو بڑے بڑے امور سر انجام دیتے تھے۔ حال کی نسبت ماضی کا سفر شاندار تھا۔ لوگ اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کرتے تھے، محنت کرتے تھے اور اپنے بڑوں کی عزت کرتے تھے۔ شعیب خالق نے اس افسانے میں "پروفیسر باپ" اور اس کے "بیٹے" کے مرکزی کردار کے ذریعے شاندار ماضی کو بیان کیا ہے۔ لیکن جدید معاشرے کے افراد اس ماضی سے سبق حاصل کرنے کی بجائے بے حس ہو گئے جس کی وجہ سے اس افسانے کا مرکزی کردار خوف اور نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو گیا۔ وہ خود تو حال میں رہنے کا تصور بھی نہیں کرتا۔ جس کی وجہ سے وہ گھر کے دیگر افراد سے بھی بات چیت کم کرتا ہے کیونکہ اسے حال اور حال کے لوگوں سے خوف آتا ہے۔ وہ حال کے بے حس لوگوں کے روائیوں کی وجہ سے انفرادی طور پر احساس محرومی کا شکار ہے۔ تاریخ سے گہرا لگاؤ رکھنے والا اس افسانے کا مرکزی کردار ہے۔ چاہتے ہوئے بھی حال میں جی رہا ہے۔ ماحول کا بہت سارا اثر انسان کی نفسیات اور داخل پر ہوتا ہے۔ فرد یا تو اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے یا اس کے خلاف رد عمل کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار زوال پذیر حال سے تنگ آ کر اپنے ماضی کو ترجیح دیتا ہے۔ وہ خود کو نہ چاہتے ہوئے بھی حال سے فرار حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس وجہ سے وہ کرب اور خوف کی کیفیت میں دوچار ہوتا ہے۔ خوف کی کیفیت کا ذکر شعیب خالق نے اپنے افسانے میں ان الفاظ میں کیا ہے:

> "باپ کی عمر ۷۰ سال کے لگ بھگ۔۔۔ مگر بغیر کسی سہارے خود چلتا اور ذہنی بیماری میں بھی بے ضرر اور ہمہ وقت تعاون پر آمادہ، کھانا پینا اپنے ہاتھوں سے اور اپنی ذات پر تاریخ کا بوجھ اٹھائے، کبھی ٹیرس پر اور کبھی کمرے میں سوچ آلود چہل قدمی بھی کر لیا کرتا تھا۔ بیٹے کے علاوہ اسے گھر کے دیگر افراد اپنے تمام تر خلوص اور پیار کی آڑ میں شک کا لبادہ اوڑھے ہوئے دکھائی دیتے۔"[۴۶]

اس افسانے کا مرکزی کردار باپ جدید معاشرے کے حالات سے خوف اور ڈر کی وجہ سے ماضی میں رہنا پسند کرتا ہے۔ اسے ماضی میں زیادہ راحت ملتی ہے۔

مایوسی وناامیدی:

شعیب خالق اکیسویں صدی کے لکھنے والوں میں شمار ہوتے ہیں۔ جدید دور کے اندر فرد کو درپیش مسائل پر ان کی گہری نظر ہے۔ جدید دور میں فرد کو درپیش مسائل میں سے ایک اہم مسئلہ مایوسی وناامیدی بھی ہے۔ اس نے افراد کو داخلی سطح پر متاثر کر کے ان کی زندگیوں کے اندر مسائل پیدا کر دیئے ہیں۔ مایوسی اور ناامیدی کا مجموعہ ڈپریشن ہے جس نے جدید معاشرے کے افراد کو کھوکھلا کر دیا ہے۔ ڈپریشن ایک اہم مسئلہ

ہے۔جدید معاشرے کے نوجوانوں کے اندر یہ مسئلہ آئے روز شدت اختیار کر رہا ہے۔

مایوسی وناامیدی سے ڈپریشن کا مرض لائق ہوتا ہے۔ڈپریشن ایک دماغی بیماری کی شکل ہے۔اس کی علامات میں بغیر وجہ کے اکثر اداس رہنا، جلدی پریشان ہونا، اکثر رونا آجانا، غصے کی زیادتی، اپنے پسندیدہ کام کرنے میں بھی خوشی محسوس نہ کرنا، جسمانی طاقت میں بتدریج کمی آنا، ملنے جلنے سے علیحدگی اختیار کرنا، گھر سے بھاگنے کی دھمکی اور کوشش، منشیات اور شراب کی عادت ہو جانا اور خودکشی کی سوچ اور بات کرنا اسکی علامات میں سے ہیں۔جدید معاشرے میں ڈپریشن کا مرض چھوٹی اور بڑی دونوں عمر کے بچوں میں پایا جاتا ہے۔جہاں تک چھوٹی عمر میں اس بیماری کا تعلق ہے تو اس کی ایک خاندانی وجہ بھی ہو سکتی ہے۔زیادہ توجہ چاہنے والے بچوں کو جب توجہ نہ ملے تو وہ اس مسئلے کا شکار ہو جاتے ہیں۔اس طرح ایسے بچے جنہیں جسمانی اور جنسی طور پر نقصان پہنچتا ہے انہیں دماغی صحت کے حوالے سے زیادہ خطرات رہتے ہیں۔ڈپریشن کے شکار نوجوانوں کو دیکھا گیا ہے کہ اکثر وہ منشیات اور شراب نوشی جیسی برائی میں مبتلا ہو جاتے ہیں

جدید معاشرے کے اندر یہ مسئلہ بہت زیادہ ہو گیا ہے جس نے فرد کی داخلی سطح کو شدید متاثر کر کے اس کے مسائل میں اور بھی اضافہ کیا ہے۔ضرورت اس امر کی ہے کہ والدین بچوں کے ساتھ زیادہ وقت گزاریں اور ان کے مسائل دریافت کر کے ان کو حل کرنے کی کوشش کریں۔اس کے علاوہ متوازن غذا بھی بہت مفید ہے۔جسمانی ورزش بھی لازمی ہے۔اس طرح ایسے کام کرنے میں بچوں کا حوصلہ بڑھانا چاہیے جن کی بدولت وہ پرسکون رہیں۔ان کے ساتھ وقت گزارا جائے اور ان کے اس قسم کے مسائل کو حل کرنے کے لیے ڈاکٹر سے رجوع کیا جائے۔شعیب خالق نے اپنے فکشن میں جدید معاشرے کے افراد کو داخلی سطح پر درپیش اس قسم کے مسائل پر قلم اٹھا کر اس کے مضمر اثرات کی طرف توجہ دلوائی ہے۔افسانہ "مندرجہ ذیل" میں اس کی جھلک ملتی ہے۔اس افسانے میں "سمندرا" ایک ایسا کوچوان ہے جس کا دوست "دادا" مرنے سے پہلے اس کو اپنے بیٹے "یوسف" کی ذمہ داری سونپ جاتا ہے کہ وہ اس کا خیال رکھے۔"دادا" کے گزر جانے کے بعد دیگر تانگے والے لوگ "یوسف" کو جنسی درندگی کا نشانہ بنانا چاہتے ہیں ۔اس مقصد کے لیے وہ "سمندرے" کی منت سماجت بھی کرتے ہیں۔ جب "سمندرا" ان کی بات نہیں مانتا تو وہ اس کو "یوسف" کا مندرجہ ذیل اور عاشق کہتے ہیں۔"سمندرا" ان کو یقین دلاتا ہے کہ "یوسف" اس کے بیٹوں کی طرح ہے مگر وہ اس کو "مندرجہ ذیل" مشہور کر دیتے ہیں۔"سمندرا" مایوسی اور ناامیدی کی وجہ سے ڈپریشن کا شکار ہو جاتا ہے اور اپنی پاک دامنی ثابت کرنے کے لیے اپنا آلہ تناسل کاٹ لیتا ہے اور ان کو کہتا ہے اب تو مجھے

"یوسف" کا مندرجہ ذیل نہیں کہو گے نا

"اوے یوسف میرا" مندرجہ ذیل" نہیں۔ سمندرے نے یہ کہتے ہوئے انگلی والی جیب سے چھوٹا سا چاقو نکالا اور اسے کھول کر اپنی شلوار کا ناڑا کاٹا تو کسی کو چاقو کی تیز دھار کا خیال نہ آیا۔ شلوار ٹخنوں پر گری۔۔۔ یہ پڑا ہے میرا مندرجہ ذیل۔۔۔ اب تو کہو گے مندرجہ ذیل، اوے ظالموں اب تو نہیں کہو گے نا۔"(۴۷)

جدید معاشرے کے اندر یہ مسئلہ عام ہے کہ اپنی پاک دامنی اور سچائی ثابت کرنے کے لیے بڑی سی بڑی قربانی کا تقاضا کیا جاتا ہے۔ جیتے ہوئے لوگ اپنوں کی ہی زندگی تنگ کر دیتے ہیں۔ زندگی میں ان کو کندھا دینے کی بجائے مرنے کے بعد ان کے جنازے کو کندھا دیتے ہیں اور اس کو ہی افضل سمجھتے ہیں اور پھر اس کی تعریف کرتے ہیں۔ یہ جدید معاشرے میں انسانی زندگی کی بے قدری کا بڑا المیہ ہے۔

افسانہ "بس ایک سگریٹ" میں ایک باپ اور بیٹے کی کہانی ہے۔ باپ ساری عمر فضول اور بے کار زندگی گزارتا ہے اور اس کو کسی ذمہ داری کا احساس نہیں ہوتا۔ اس کا بیٹا گاڑی کے حادثے میں جب شدید زخمی ہوتا ہے تو باپ مایوسی و ناامیدی سے ڈپریشن کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ ساری ساری رات بیٹے کی فکر میں رہتا ہے جب کوئی چارہ نہیں رہتا تو رات بھر رو رو کر عبادت کرتا ہے اور اس کی صحت یابی کے لیے دعائیں کرتا ہے۔

"میری کار ایک درخت کو جالگی۔۔۔ میرا باپ وہ تمام وقت ہسپتال میں رہا اور میں نے اسے ساری زندگی کبھی نماز پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا تھا مگر بیوی نے بتایا وہ ہسپتال کی مسجد میں ساری رات نماز ادا کرتے اور رو رو کر میرے لیے دعائیں مانگتے رہے تھے۔"(۴۸)

جدید معاشرے کے اندر دیکھا جائے تو زیادہ تر نوجوان فضول اور بے مقصد زندگی گزار رہے ہیں۔ انہیں اپنی ذمہ داری کا احساس عموماً اس وقت ہوتا ہے جب اچانک ان کے کندھوں پر گھر کی ذمہ داری آجائے یا ان پر کوئی مصیبت آجائے۔ یہ جدید معاشرے میں ایک بڑا المیہ ہے جس نے داخلی سطح پر افراد کی زندگیوں کو اجیرن کر دیا ہے۔ کچھ لوگ جدید معاشرے کے افراد کی صورتحال دیکھ کر حال کی بجائے ماضی اور ماضی سے جڑی یادوں کے اندر آج بھی مسائل کا حل ڈھونڈتے ہیں۔

"بیٹا آج تک آتے آتے تاریخ بے حیرانگی کا شکار ہو چکی ہے۔ ماضی کا زمانہ حیرت کا

زرخیز ترین زمانہ ہے۔ مستقبل میں تو حیرانگی حسیات سے مبرا اور ایک میکانکی عمل بن کر رہ جائے گی۔۔۔یہ کہ کرپاپ بند ٹی وی کی سیاہ سکرین دیکھتے اور غصہ ضبط کرتے ہوئے کچھ سوچنے لگا۔"(۴۹)

افسانہ "مونولاگ" ایک ایسا افسانہ ہے جس میں "مسرت علی چیمہ "کا کردار ہے جو محنت کر کے اپنا نام بناتا ہے اور خوب بلندیوں پر پہنچ جاتا ہے۔ایک دن اچانک وہ کاروبار کی ذمہ داریوں کو بیٹے کو سونپ کر گھر بیٹھنے کا پروگرام بناتا ہے۔وہ سارا سارا دن تنہا کمرے میں اکیلا وقت گزارتا ہے۔اس کا روز کا معمول ٹی وی دیکھنا،مایوس پروگرام سننا اور اس طرح فضول وقت گزارانا بن گیا۔اس سے آئے روز اس کی صحت کمزور ہونے لگی۔وہ روز فضول وقت گزار گزار کر مایوس اور ناامید ہونے لگا جس سے وہ ڈپریشن کا شکار ہو گیا۔اس کے گھر والوں نے اس کو بہت سمجھایا،اس کا علاج کروایا مگر اس کی صحت ٹھیک نہیں ہو سکی۔

"خود ساختہ ریٹائرمنٹ کے چند پہلے فرصتی ہفتوں میں ہی غیر محسوس انداز سے ٹی وی اخبار نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا اور یوں داخلی تنہائی کا بہلاؤ کے سبب، کہیں خارجی تناؤ بھی اسکے اندر اترتا چلا گیا۔۔۔ٹی وی سکرین پر خودکش حملے،ٹارگٹ کلنگ،ریموٹ بم دھماکے۔۔۔نے اس کے مونولاگ میں آہستہ آہستہ تلخی بڑھانا شروع کر دی۔"(۵۰)

جدید معاشرے کے اندر بے روزگاری، مہنگائی، افراط زر، معاشی بدحالی اور ملکی سیاسی مسائل کی وجہ سے لوگ مایوسی اور ناامیدی کا شکار ہو کر ڈپریشن کا شکار ہو گئے ہیں۔ٹی وی اور دیگر کچھ فضول پروگراموں کی وجہ سے لوگوں کے اندر مایوسی پھیل رہی ہے

ذہنی کشمکش:

شعیب خلق نے اپنے فکشن کے اندر حالات وواقعات کو پیش نظر رکھتے ہوئے نفسیاتی الجھنوں کی عکاسی کی ہے۔نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہونے والا فرد مختلف مسائل میں جکڑا ہوا ہوتا ہے۔بعض اوقات بیشتر ذمہ داریوں اور کاموں میں اس طرح گھیرا ہوا ہوتا ہے کہ فرد ذہنی دباؤ کا شکار ہو جاتا ہے۔ذہنی دباؤ اور کشمکش کی ایک اہم وجہ جذباتی اور جسمانی تبدیلیوں کا باعث بنتی ہے۔ذہنی کشمکش ایک فطری انسانی عمل ہے جو مختلف صورتوں میں رہتا ہے۔اس فطری انسانی عمل سے ہر انسان کئی بار سامنا کرتا ہے۔ذہنی کشمکش کا شکار ہونے والے افراد کے لیے تناؤ، دباؤ، کشیدگی اور پریشانی جیسے لفظ استعمال کیے جاتے ہیں۔کشمکش ایک صنفی جذباتی آزمائش ہوتی ہے۔انسان کے اندر حیاتیاتی، جذباتی اور جسمانی تبدیلیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔اس قسم کی

تبدیلیاں ذہنی کشمکش کی وجوہات اور اس کے اثر انداز ہونے کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ بعض اوقات کام کی ضرورت اور مہیا ہونے والی سہولیات میں اختلافات ذہنی کشمکش کی وجہ بنتی ہیں۔ذہنی کشمکش کو عام طور پر دو مختلف کیفیات میں بیان کیا جاتا ہے۔بعض اوقات ایک فرد مثبت ذہنی کشمکش کا شکار ہوتا ہے جو فائدہ مند ہے کیونکہ بعض اوقات مختلف امور کو سر انجام دینے کے لیے ذہنی کشمکش کا ہونا بھی ضروری ہوتا ہے۔ایک ذہنی کشمکش کی صورت منفی بھی ہوتی ہے۔یہ صورت تکلیف اور نقصان کا باعث بنتی ہے کیونکہ انسان جب اپنے ماحول اور معاشرے سے خطرہ محسوس کرتا ہے تو اس غصے کی کیفیت میں لڑنے اور بھاگ جانے جیسے رد عمل کا مظاہرہ کرتا ہے۔غصے کی صورت میں انسان کے خون کا بہاؤاور سانس پہلے کی نسبت تیز ہو جاتی ہے اور جذبات واحساسات کا جذبہ ابھر جاتا ہے۔جس کی وجہ سے انسان کا دماغ سوچنے سمجھنے کی اعلی صلاحیتوں سے محروم ہو جاتا ہے۔اس وجہ سے ایک انسان کے اندر جذبات پہلے کی نسبت زیادہ ابھر جاتے ہیں۔ایسے حالات میں انسان مقابلہ تو کرتا ہے مگر ذہنی کشمکش کا شکار ہونے کی وجہ سے بہتر فیصلہ نہیں کر سکتا۔حالانکہ ذہنی کشمکش کی کیفیت ایک قدرتی عمل ہے۔اپنے کام کاج کو پورا کرنے کے لیے روز مرہ زندگی میں فرد ذہنی کشمکش کا شکار ہوتا ہے۔ذہنی کشمکش کی وجہ سے انسانی دماغ کمزور ہو جاتا ہے اور اس کے اثرات بھی نہایت نقصان دہ ہوتے ہیں صفیہ عبادر قمطراز ہیں:

> "ذہنی ناآسودگی، داخلی گھٹن فرد کے اندر صرف منفی سوچوں اور مایوسی کو ہی جنم نہیں دیتی بلکہ ہر شئے کے خارجی وجود کے اندر داخلی کیفیات کا کھوج بھی ایک غیر محسوساتی سطح پر نظر آنے لگتا ہے۔یہ اس کی ذہنی کشمکش اور متصادم سوچوں کی بھی ایک صورت اور حوالہ ہے"(۵۱)

ذہنی کشمکش کا شکار رہنے والے افراد دل کی بیماریوں، مختلف دماغی اور جسمانی بیماریوں میں مبتلا رہتے ہیں۔ذہنی کشیدگی پر قابو پانا بھی نہایت ضروری ہوتا ہے۔اس کے لیے ضروری ہے کہ جسمانی توازن کی کیفیت کو بر قرار رکھا جائے۔ذہنی کشمکش کو کم کرنے کے لیے غوروفکر کرنا، گہرے سانس لینا، ورزش کرنا اور متوازن غذا کا استعمال نہایت ضروری ہے۔مگر جدید معاشرے میں فرد کی ذہنی کشمکش کی کیفیت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔اس کی بنیادی وجہ کام کاج کا بے جا بوجھ ہوتا ہے۔جس سے جدید معاشرے کے افراد جسمانی تناؤ اور ذہنی کشمکش کا شکار ہوتے جا رہے ہیں۔مسائل میں اضافے کے باعث ایک بڑی تعدد ذہنی کشمکش کا شکار ہے۔شہری رہن سہن میں تبدیلی کے باعث جذباتی الجھنوں اور تعلقات کی پیچیدگی میں بہت اضافہ ہوا

ہے۔ ترقی یافتہ دور میں لوگ اپنے آپ سے بہت زیادہ امیدیں وابستہ کر لیتے ہیں۔ مایوسی، افسردگی اور ناکامی کی وجہ سے جدید معاشرے کے افراد کے اندر برداشت کی قوت بہت کم ہو گئی ہے۔

ذہنی کشمکش کا شکار ہونے والے ازدواجی زندگی سے وابستہ افراد بھی ہیں۔ ازدواجی زندگی میں اختلافات ایک عام سی بات ہو گئی ہے۔ جدید معاشرے کے اندر ایسے افراد بھی ہیں جو اپنی ازدواجی زندگی کے مسائل اور اختلافات سے تنگ آکر ذہنی کشمکش کو کم کرنے کے لیے شراب اور نشیلی ادویات کی طرف راغب ہو جاتے ہیں۔ نفسیاتی پریشانیوں اور ذہنی کشمکش میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے اس کی کئی وجوہات ہیں۔ اس کی ایک اہم وجہ مناظر فطرت بھی ہے۔ جدید معاشرے کا فرد خدا اور کائنات کے حوالے سے بھی غور و فکر کرتا ہے۔ ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو کر خدا کے وجود کے حوالے سے بھی سوچتا ہے کہ آخر خدا کون ہے؟ اس نے یہ کائنات کیوں بنائی؟ وہ ارتعاش آہنگ اور لفظوں کی بنت سے مختلف تصویریں بنا بنا کر اپنے سوالات کے جوابات تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی عکاسی شعیب خالق نے اپنے افسانے "وائجر ٹو" میں ان الفاظ میں کی ہے:

> "ڈرتا تو میں اور بھی چیزوں سے ہوں مثلاً خدا کو ہی لے لو۔ لیکن تمہاری آنکھوں میں اس کا کیا چہرہ بنتا ہے۔ وہی ارتعاش جو آہنگ لفظ اور آبیت اگلتا ہے لیکن اس کی کوئی تصویر ارتعاش کی کوئی اپنی تصویر نہیں ہوتی۔ وہ جو کچھ اگلتا ہے اس میں تصویریں ہوتی ہیں۔"(۵۲)

انسان خدا کی ذات کے حوالے سے بھی ذہنی کشمکش کا شکار ہوتے ہیں۔ خدا کی ذات اور اس کی موجودگی کے حوالے سے انسان مختلف سوالات کو سوچتا ہے۔ اور اپنے ان ہی سوالوں میں مختلف تصویریں ذہن میں لاتا ہے۔ جو کچھ سوچتا رہتا ہے یا اگلتا ہے اس کی تصویریں تصوراتی طور پر بناتا رہتا ہے۔ بعض اوقات انسان اپنے سوالوں میں اس قدر کھو جاتا ہے کہ وہ نفسیاتی اور ذہنی کشمکش کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس وجہ سے فرد ذہنی دباؤ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ مناظر فطرت، کائنات اور خدا کے حوالے سے غور و فکر کرنے والے افراد ایسے جواب نہ ملنے کی وجہ سے ذہنی کشمکش کا شکار ہو جاتے ہیں۔ شعیب خالق نے بھی اپنے افسانے کے اندر اس ہی پہلو کی عکاسی کی ہے کہ جدید معاشرے کے اندر سہولیات کے میسر ہونے کی وجہ سے انسان اپنے سوالات کے جواب کا متلاشی ہے۔ مختلف حربوں کو زیر استعمال کرتا ہے لیکن ذہنی کشمکش میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

افسانہ "وائجر ٹو" میں شعیب خالق نے انسانوں کی ذہنی کشمکش کو پیش کیا ہے۔ حالات و واقعات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس دنیا کے اندر حاصل اور لاحاصل جیسی الجھنوں کو موضوع بنایا ہے۔ انسان اس دنیا کے اندر تمام تر سماجی پریشانیوں اور الجھنوں کا شکار ہو کر اس دنیا کو ہی اپنا اصل سمجھتا ہے۔ سانس کے چڑھاوے سے پہلے تک ہی انسان ساری زندگی نفسیاتی دباؤ کا شکار ہو کر اپنی زندگی بسر کر دیتا ہے۔

شعیب خالق نے مختلف اصولوں سے خیالات مستعار لے کر اپنے نظریات کو اس انداز سے پیش کیا ہے کہ ان کے کرداروں کی ذہنی صلاحیتوں، الجھنوں، مسائل اور حالات واقعات کو مد نظر رکھتے ہوئے انسان کی ذہنی کشمکش کا جائزہ لیا ہے۔ ذہنی کشمکش کی صورتحال کی عکاسی ان کے افسانے "وائجر ٹو" میں یوں نظر آتی ہے:

> "مایا تو سب کچھ ہے، ہم ہماری معیشت، تمدن، مذہب، ثقافت ساری دنیا یہاں ہر شئے لفظوں کی معرفت سمجھی اور سمجھائی جاتی ہے۔ تو پھر یہ ڈھونگ، خود کو سمجھا ہوا سمجھانے کا؟ اس لیے کہ زندگی کی بھینٹ چڑھے یہ چڑھاوے، سانس لیتی رگوں کے پھولتے اور سکڑتے دھوکوں کو اپنا حاصل سمجھتے ہیں۔۔۔ جو دراصل لاحاصل سمجھتے ہیں۔"(۵۳)

ذہنی کشمکش کے حوالے سے شعیب خالق نے اپنے نظریات پیش کیے ہیں۔ جس میں فرد کی انفرادی زندگی کو خاص طور پر موضوع بنایا ہے۔ شعیب خالق کا کہنا ہے کہ دنیا کی ہر شئے مایا ہے۔ ایک نہ ایک دن ختم ہو جائے گئی۔ دنیا میں ہر شئے کی حیثیت لفظوں میں ہے۔ لفظوں کے ذریعے ہی سے ہر فرد اپنی ضروریات پوری کرتا ہے۔ افراد کے ساتھ اس دنیا کی حیثیت مایا ہے۔ یہ ایک نہ ایک دن ختم ہو جائے گئی۔ لیکن اس کے باوجود بھی فرد نے دنیا میں آنے کے بعد خود کو بہت کچھ سمجھ لیا ہے۔ مایا ہونے کے باوجود یہ فرد دنیا میں ایک الگ ہی ڈھونگ میں رہتا ہے۔ حالانکہ انسانی زندگی کی حیثیت صرف سانس اور رگوں کے سکڑنے اور پھولنے تک ہی ہے۔ انسان اس دنیا میں کیا سے کیا کرنا چاہتا ہے وہ بہت کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے جو دراصل لاحاصل ہوتا ہے۔

فرد کی زندگی پر ذہنی کشمکش کے اثرات کے حوالے سے دیکھا جائے تو شعیب خالق نے "وائجر ٹو" میں ذہنی کشمکش کی عکاسی کی ہے۔ اس افسانے کے ذریعے فرد کی ذہنی صلاحیتوں، الجھنوں اور حالات واقعات کو مد نظر رکھتے ہوئے انسانی سوچ کا جائزہ لیا ہے اور اسی حوالے سے شعیب خالق نے اپنے خیالات کو یوں پیش کیا ہے:

> "ہاں، سارا راستہ خالی پڑا ہے۔ ہزاروں سالوں کا راستہ کہاں تک زندگی عمر کو لپیٹ لپیٹ

رکھے گی۔ استعمال شدہ طاقت ایک حصار توڑ کر پہلے سے کم رہ جاتی ہے۔یوں سارا سفر
ہی مایا لگتا ہے، دم گھٹ جاتا ہے اپنی عمر کا اور پھر رونے کو جی چاہتا ہے۔"(۵۴)

ذہنی کشمکش کی صورتحال کی عکاسی کرتے ہوئے راستے اور انسانی زندگی کا تقابل کرتے ہوئے مایا کی صورتحال کو پیش کیا ہے کہ راستے ہزاروں سالوں تک ختم نہیں ہو سکتے۔ لیکن انہی راستوں میں چلنے والا انسان آدھے راستے میں ہی دم توڑ دیتا ہے۔ دم گھٹ جانے کی وجہ سے آگے کا سفر فنا ہو جاتا ہے۔ انہی راستوں میں چلنے والا انسان منزل تک پہنچنے کی ہر حال میں کوشش کرتا ہے لیکن انسان کو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ اس کی زندگی کا سفر کہاں ختم ہو جائے گا۔ انسانی زندگی مایا ہونے کے باوجود بھی اپنی زندگی کی حقیقت سے انجان ہوتی ہے۔ زندگی بہت تھوڑی ہوتی ہے لیکن سفر بہت طویل ہے۔ یہی سفر انسانی زندگی کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔

شعیب خالق نے اپنے افسانے "بے حیرانگی" کے اندر "باپ" کے کردار کے ذریعے ذہنی کشمکش کی صورتحال کو پیش کیا ہے۔ اس افسانے میں باپ کا کردار اپنی تاریخ سے بے جا محبت کی وجہ سے اپنی صلاحیتوں سے بالکل بیگانہ ہو جاتا ہے۔ ہر وقت ماضی میں رہنا پسند کرتا ہے۔ حال کی نسبت وہ ماضی میں کیے گئے کارناموں کو زیادہ ترجیح دیتا ہے۔ ہر چھوٹے اور بڑے کام کے لیے وہ ماضی سے ہی حل ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہے شعیب خالق نے اس حوالے سے ذہنی کشمکش کی عکاسی اپنے افسانے بے حیرانگی میں یوں کی ہے:

"پروفیسر صاحب کا جسم اپنے موجود لمحے میں سانس لیتا ہے۔ مگر ان کا دماغ ماضی کے
کسی گوشے میں حقیقی کیفیت لیے وہاں بھی موجود رہتا ہے۔۔۔ تاریخ کہیں اپنے نتائج
لے کر ان کے تحت الشعور میں جا بیٹھی ہے۔ اور اب وہ تحت الشعوری دنیا ہی ان کی
من پسند دنیا ہے۔"(۵۵)

اس افسانے میں ذہنی کشمکش سے جڑے ہوئے باپ کا کردار جو تاریخ ہی میں خود سانس لیتا ہے۔ حالانکہ اس کا وجود تو حال میں ہے۔ مگر دماغ ماضی کی کیفیت میں لپیٹا ہوا ہے۔ تاریخ سے گہرا لگاؤ ہونے کے باعث ماضی کے کارنامے اس کے تحت الشعور میں جا بیٹھ گئے ہیں۔ ذہنی کشمکش کا شکار یہ کردار حال کی نسبت ماضی کو بہتر گردانتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کا وجود حال میں ہونے کے باوجود بھی دل و دماغ ماضی سے جڑا ہے۔ وہ تحت الشعور کی وجہ سے ماضی کی دنیا کو ہی اپنی من پسند دنیا گردانتا ہے۔ جب حال کی نسبت ماضی میں زیادہ بہتر کام سرانجام دیے گئے ہوں تو ماضی سے لگاؤ رکھنے والا فرد بھی خود کو ماضی میں ہی دھکیل دیتا

ہے۔ذہنی کشمکش کا شکار بھی انسان اسی وقت ہوتا ہے جب اس کے سامنے حال میں رہنے والے افراد کی نسبت ماضی کے افراد کی صورتحال بہتر ہو۔ماضی سے وابستہ یہ افراد خارج اور باطن کے تضاد میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔یہی تضاد ایک بیماری بن کر اس کے دماغ سے جاچمٹتا ہے۔حال میں رہنے والے یہ افراد خود کو اس دنیا سے انجان خیال کر لیتے ہیں اور اپنے اندر کی دنیا میں ایک اور سچائی کو تلاش کرنے کی کوشش میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔اسی کی عکاسی شعیب خالق نے یوں کی ہے:

> "خارج اور باطن کے بیچ کا تضاد ہی سچائی کی بیماری بن کر اس کے دماغ سے جا چمٹا تھا۔اب باہر کی دنیا میں وہ خود کو انجان خیال کرتا اور اندر کی دنیا میں وہ ایک الگ سچائی کی شناسائی میں گم ہوا بیٹھا تھا۔پچھلے چند دنوں سے وہ بے نیندگی کا بھی شکار چلا آرہا تھا۔"(۵۶)

ذہنی کشمکش کے حوالے سے شعیب خالق نے جدید معاشرے کے اندر فرد کی نفسیات کی حقیقی ترجمانی کی ہے۔شعیب خالق نے یہاں انسانی سرشت کے حوالے سے یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ اگر انسان کسی بھی حوالے سے کوئی چیز ٹھان لے تو کوئی بھی چیز اس کے راستے کی رکاوٹ نہیں بن سکتی۔

افسانہ "خلیے پر لکھی ہوئی تحریر" میں شعیب خالق نے جدید معاشرے کے فرد کے معاشرتی روائیوں کی حقیقی ترجمانی کی ہے۔انسان اس دنیا میں مختلف امور سرانجام دینے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے لیکن ابھی بھی بہت سارے ایسے کارنامے ہیں جو وہ سرانجام نہیں دے سکا۔بحیثیت انسان ہر ذہن کے اندر خدا کا تصور موجود ہے لیکن حواس خمسہ کے باوجود بھی خدا کی کوئی تصویر پیش نہیں کر سکا۔انسان خدا کے وجود کے حوالے سے ذہنی کشمکش میں مبتلا ہے۔لفظ اور ارتعاش کی بدولت خدا کی تصویر تو بناتا ہے۔مگر جس طرح ارتعاش کی کوئی اصل تصویر نہیں ہوتی اسی طرح انسان بھی خدا کی تصویر ارتعاش کی طرح بناتا ہے جس کا کوئی اصل چہرہ سامنے نہیں آتا۔لیکن خدا کے موجود ہونے کا احساس ارتعاش کی طرح مختلف صورتوں میں بٹا ہوا ہے۔اس حوالے سے یوں شعیب خالق یوں رقمطراز ہیں:

> "ڈرتا تو میں اور بھی بہت سی چیزوں سے ہوں مثلا خدا کو ہی لے لو،لیکن تمہاری آنکھوں میں اس کا کیا چہرہ بنتا ہے۔وہی ارتعاش جو آہنگ،لفظ اور آسیبت اگلتا ہے۔لیکن اس کی کوئی تصویر ارتعاش کی کوئی اپنی تصویر نہیں ہوتی۔وہ جو کچھ اگلتا ہے اس میں تصویر بنی ہوتی ہیں۔"(۵۷)

شعیب خالق نے اپنے افسانے "دوہرا سمندر" میں بھی وضاحت کی ہے کہ انسان کی نفسیات پر اس کے گردونواح کا ماحول بہت زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔ انسان یا تو اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے یا اس کے خلاف اپنے ردعمل کا مظاہرہ کرتا ہے۔ نفسیاتی الجھنوں کے باعث انسان اپنی زندگی کا سفر ایک محدود وقت میں گزار دیتا ہے۔ حالانکہ انسان جب اس دنیا میں آتا ہے تو ایک طویل عرصہ اسے مہیا کیا جاتا ہے۔ مگر یہ انسان ساری زندگی انجانے طور پر ایسے ہی گزار دیتا ہے۔ ہر چیز اپنے مقررہ وقت پر مختلف امور سرانجام دے رہی ہوتی ہے۔ سمندر رواں دواں ہوتا ہے، جزیرہ بہتا رہتا ہے مگر انسان کا ضمیر جب جاگتا ہے تو اس کے جانے کا وقت آجاتا ہے۔ انسان جب اس دنیا میں آتا ہے تو اس دنیا کی آرائش وزیبائش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اسے واپسی کا کبھی خیال ہی نہیں آتا۔ ہر چیز اپنی مقررہ جگہ پر موجود ہوتی ہے۔ وہی درختوں کے جھنڈ، وہی سمندروں کی روانگی، وہی جزیرے مگر انسان کا وجود اس قدر بڑھ چکا ہوتا ہے کہ اس کے پاس واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہوتا۔ صدیاں گزارنے کے باوجود بھی یہ انسان مختلف الجھنوں کا شکار رہتا ہے۔ انہی خیالات کو مدنظر رکھتے ہوئے شعیب خالق نے اپنے نظریات پیش کیے ہیں کہ انسان کس طرح اس دنیا میں آنے کے بعد ذہنی الجھنوں کا شکار ہوتا ہے۔

اس افسانے میں مصنف لکھتے ہیں:

> "پھر نہ جانے میں کتنی صدیاں سویا رہا۔۔۔ جزیرہ بہتا رہا۔۔۔ سمندر چلتا رہا۔۔۔ لیکن جب میری آنکھ کھلی تو میرے بڑے ہوئے وجود کے سوا۔۔۔ سب کچھ ویسا ہی تھا۔۔۔ وہی درختوں کے جھنڈ اور۔۔۔ اور وہی سمندر۔۔۔"(۵۸)

تنہائی:

شعیب خالق نے اپنے افسانے "ڈور" میں ایک اور بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ تنہائی کا دارومدار انسان کی سوچ پر ہوتا ہے۔ بعض لوگ جدید معاشرے کی افراتفری کی وجہ سے تنگ آکر تنہائی کے لمحات ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کچھ لوگ احساس محرومی کی وجہ سے لڑتے لڑتے اپنی ساری زندگی بسر کر دیتے ہیں۔ ویسے تو دیکھا جائے تو تنہائی کی یہ خوبی ہے کہ انسان اس دنیا میں اکیلا ہی آتا ہے اور اکیلا ہی اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔ تنہائی کا احساس جدید معاشرے کے فرد کے اندر اس وقت شروع ہوتا ہے جب ایک انسان خود کو سماجی طور پر علیحدہ اور ٹھکرایا ہوا محسوس کرنے لگے۔ دوست واحباب اور رشتہ داروں کی کمی محسوس ہونے لگے تو وہ اس بھرے پڑے سماج کے اندر خود کو تنہا محسوس کرنے لگتا ہے۔ ایسے فرد کو یوں

محسوس ہوتا ہے کہ اس اتنی بڑی دنیا کے اندر اس کا کوئی اپنا نہیں ہے نہ وہ کسی کا ہے۔ جس وجہ سے وہ فرد خود ہی اکیلے لڑتے لڑتے اپنی زندگی گنوا دیتا ہے۔ تنہائی کا شکار انسان صحت کے حوالے سے بھی اچھا نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر بہت سارے ایسے طلبا جو یونیورسٹیوں کے اندر اپنے احباب سے ملنے کی بجائے اکیلے زندگی گزارنے کے عادی ہوتے ہیں۔ ایسے طلبا کا نظام قوت مدافعت دوسرے طلبا کے مقابلے میں بہت ہی کمزور ہوتا ہے۔ کچھ طلبا اپنے ہی ہم جماعت دوستوں کے ہنسی مزاح، کھیل کود اور تفریح میں وقت گزارنے کے عادی ہوتے ہیں۔ ایسے احساس تنہائی کے شکار طلبا ان احباب کے ساتھ وقت نہیں گزار سکتے کیونکہ وہ احساس محرومی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ احساس محرومی کے شکار افراد ذہنی دباؤ میں مبتلا رہتے ہیں۔ پریشانی، مایوسی اور افسردگی جیسے امراض میں مبتلا طلبا دوائیوں کا استعمال کرتے ہیں مگر ان کے اندر احساس محرومی کی کیفیت ختم نہیں ہوتی۔ سماجی زندگی کے اندر بھی یہی طلبا کنارہ کشی اختیار کر لیتے ہیں حالانکہ سماجی زندگی سے دوری اختیار کرنا ایسے طلبا کا اپنا فیصلہ ہوتا ہے۔ مگر احساس تنہائی ایک ایسی ذہنی کیفیت ہے جو دوسرے لوگوں سے دوری اختیار کر کے اطمینان کا سانس لیتے ہیں۔ حالانکہ احساس تنہائی ایک ایسی ذہنی کیفیت ہے جس میں مبتلا فرد اپنے آپ کو سماجی زنجیروں سے علیحدہ ہو کر یہ سوچنے لگتا ہے کہ اس کی خواہشات کا کسی کو بھی احساس نہیں ہے۔ تنہائی کا احساس فرد کے اندر اس وقت ابھر کر سامنے آتا ہے جب وہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ اس کا کوئی چاہنے والا ہی نہیں ہے، اس کا کوئی آپنا نہیں ہے۔ جب یہی فرد اسی ماحول کے اندر اپنے آپ کو بیگانہ محسوس کرنے لگتا ہے تو وہ احساس تنہائی کا شکار ہو جاتا ہے۔

احساس تنہائی کی کیفیت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب فرد کو یہ محسوس ہو کہ وہ اپنے دکھ، احساسات اور جذبات کو کسی کے ساتھ نہیں بانٹ سکتا۔ ایسے فرد کو احباب بنانے میں بہت دشواری محسوس ہوتی ہے جس کی وجہ سے احساس کمتری میں مبتلا یہ فرد احساس تنہائی جیسے مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ وہم کی وجہ سے وہ دوسرے لوگوں سے بھی ہم کلام نہیں ہوتا۔ احساس تنہائی کے شکار افراد اپنے مسائل اور مشکلات کو دوسروں کے ساتھ بانٹنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرنے لگتے ہیں۔ احساس تنہائی کے شکار افراد اپنے ارد گرد کا دائرہ بھی بہت محدود کر لیتے ہیں۔ احساس تنہائی کے شکار بعض افراد ایک جگہ سے دوسری جگہ فرار کا راستہ اختیار کر لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر کچھ بچے احساس تنہائی کا شکار ہیں تو اپنے والدین کا گھر چھوڑ کر وہاں سے بھاگ جاتے ہیں۔ انھیں آنے والے مسائل اور مشکلات کا بالکل بھی اندازہ نہیں ہوتا جس کی وجہ سے یہی بچے احساس تنہائی کے مرض میں مبتلا ہو کر غلط راستے پر چل نکلتے ہیں اور مختلف جرائم میں اضافے کا بھی باعث بنتے ہیں۔

شعیب خالق نے جدید معاشرے کے اندر فرد کی داخلی کیفیت کو اس انداز سے پیش کیا ہے کہ انسان داخلی کرب میں مبتلا ہو کر احساس تنہائی کا شکار ہو جاتا ہے۔ احساس تنہائی کی یہی کیفیت انسان کو نفسیاتی مرض میں مبتلا کر دیتی ہے۔ شعیب خالق نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ جدید معاشرے کے اندر جہاں ہر چیز کی جگہ مشینوں نے لے لی ہے وہیں اس بھرے سماج کے اندرانسان احساس تنہائی کا بھی شکار ہو گیا ہے۔ جدید معاشرے کے اندر ایک انسان کا دوسرے انسان کے لیے بے حسی کا احساس اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ انسان خود کو تنہا محسوس کرنے لگا ہے۔ نفسیاتی ڈور میں پھنس کر دوسرے انسانوں کے حوالے سے لاپرواہی جدید معاشرے کا المیہ ہے۔ احساس تنہائی کی عکاسی شعیب خالق نے اپنے افسانے "ڈور" کے اندر یوں کی ہے:

> "پتہ نہیں، زندگی کے اس سفر میں بھی دو حصّوں میں بٹا ہوں تو شاہد بعض میں بھی ایسا ہی ہو۔ لیکن کیوں نہ میں ڈور کے پنے کے اندر سرایت کر جاؤں۔ ڈور کی دھار پر رینگتا رینگتا اتنا گہرائی میں اتر جاؤں کہ پھر مجھے لگے جیسے میں خود ڈور ہوں۔ یوں میں پھر آخری سرا، اپنے اندر ہی کریدوں اور ادھیڑوں۔"(۵۹)

احساس تنہائی میں مبتلا شخص اپنی زندگی کو دو حصّوں میں بٹا ہوا محسوس کرتا ہے۔ ویسے تو انسان ایک سیدھی ڈور کی مانند اپنی زندگی بسر کر دیتا ہے مگر احساس تنہائی میں مبتلا فرد اپنے آپ کو ڈور کے پنوں میں ہی گھسیٹتا جاتا ہے۔ اسے ایسا لگتا ہے کہ وہ رینگ رینگ کر ڈور کے اگلے پنوں میں جا کر اپنی زندگی کو سنوار لے گا۔ مگر ڈور کے آخری سرے تک پہنچنے کے باوجود بھی احساس تنہائی جیسے مرض سے باہر نہیں نکل سکتا۔ یعنی کہ احساس تنہائی میں مبتلا فرد جوں جوں اپنی زندگی گزارتا جاتا ہے اس کا مرض پہلے سے بڑھتا جاتا ہے۔ احساس تنہائی کا شکار ہونے کی وجہ سے ایک فرد کبھی بھی اپنے آپ کو اس دنیا کی چہل پہل میں شامل نہیں کر سکتا۔ جس کی وجہ سے وہ اندر ہی اندر ڈور کو کریدنے اور ادھیڑنے جیسی کشمکش میں مبتلا رہتا ہے۔ مگر کبھی بھی احساس تنہائی جیسے مرض سے نجات حاصل نہیں کر سکتا۔

شعیب خالق نے اپنے افسانے "ٹوٹ کر بچھڑنا" میں ایک اور بات کی وضاحت کی ہے کہ تنہا ہونا اور اکیلا ہونا دو مختلف صورتیں ہیں۔ احساس تنہائی ایک ایسی ذہنی کیفیت ہے جو دوسرے انسانوں سے ایک فرد کو الگ ہونے کا احساس دلاتی ہے۔ احساس تنہائی کے شکار افراد دوسرے انسانوں کی نسبت اکیلے پن کو زیادہ محسوس کرتے ہیں۔ ناامیدی اور بے بسی کی کیفیت احساس تنہائی کو ابھارنے کا موجب بنتی ہے۔ کیونکہ جب انسان یہ سوچنے لگ جاتا ہے کہ کوئی اس کی کی پروہ نہیں کرتا، کسی کو اس کی فکر نہیں، میں مر جاؤں یا جیوں

میری حیثیت ایک سی ہی رہے گئی۔ اگر میں مر گیا تو کوئی بھی میری قبر پر نہیں آئے گا۔ یہ ایسی کیفیات ہیں جو انسان کو گہری تنہائی میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ سماجی علیحدگی اور جدید معاشرے کے اندر صنعتی ترقی نے اس کیفیت کو مزید ابھارا ہے۔ کیونکہ جب انسانی زندگی کے اندر سکون ختم ہو جاتا ہے تو وہ تنہائی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ سکون کے خاتمے کا باعث بننے والی شئے صنعتی ترقی ہی ہے کیونکہ صنعتی ترقی نے ہی فرد کے اندر کو زنگ آلود کر دیا ہے۔ صنعتی ترقی کی بدولت انسانوں کے اندر جذبہ ختم ہو گیا، غم بڑھ گیا ہے۔ یہ کیفیت انسانوں کے باہر سے نہیں بلکہ انسان کے اندر سے پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ صنعتی ترقی کی بدولت فرد کے پاس رہنے والے چہرے، فرد کے محبوب چہرے اور فرد کو مانوس کرنے والے چہرے جب اسی فرد سے انجان ہو جاتے ہیں تو وہی فرد احساس تنہائی کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ صنعتی ترقی کی بدولت فضا میں آلودگی بہت بڑھ گئی ہے۔ اور آلودگی نے بھی انسانی زندگی کے اندر تنہائی کو فروغ دیا ہے۔ کیونکہ آلودگی کی وجہ سے انسان فطرت سے محروم ہو گیا ہے۔ فطرت سے محرومی کے باعث رومانیت کا جذبہ ماند پڑ گیا ہے۔ جس کی وجہ سے فرد کو بھی اپنے ماحول سے کوئی بھی دلچسپی نہیں رہی۔ فطرت کی محرومی اور انسانی زندگی کی مصروفیت نے احساس تنہائی کی کیفیت کو مختلف صورتوں میں ابھارا ہے۔ اس کی عکاسی شعیب خالق نے اپنے افسانے کے اندر یوں کی ہے:

> " آسمان آلودہ کر دیا گیا، ستاروں اور سیاروں کی تفریق ختم ہوتی جا رہی ہے۔ سورج بادلوں کے پیچھے چھپا رہتا ہے۔ اس کی گرم سانسوں کو وہ خالص بھاپ نہیں ملتی جسے وہ کبھی اپنے ذائقے اور زندگی کے درمیان زیادہ دیر حائل نہیں ہونے دیتا تھا۔ مگر اب تو سورج بادلوں کو پھونکیں مارتا رہتا ہے اور انہیں اپنی سانسوں سے جھاڑتا رہتا ہے، اور بادل ہیں کہ ہٹتے ہی نہیں۔ "(۶۰)

شعیب خالق نے ٹیکنالوجی کے مضر اثرات اور اس کی تباہ کاریوں اور آلودگی کو موضوع تحریر بنایا ہے۔ صنعتی ترقی کی بدولت فطرت کی خوبصورتی ماند پڑ گئی۔ صنعتی ترقی نے کس طرح ماحول کو آلودہ کر دیا۔ جدید معاشرے کے اندر فطرت کی ماند پڑ جانے کی وجہ سے اور صنعتی ترقی کی بدولت انسانی زندگی میں احساس تنہائی کی کیفیت ابھر کر سامنے آ گئی ہے۔ صنعتی ترقی نے جہاں فرد کی معاشی صورتحال کو بہتر بنایا ہے وہیں ماحولیات کو بھی آلودہ کیا ہے اور فرد کے اندر احساس تنہائی کی کیفیت پیدا کرنے کا موجب بنی ہے۔

افسانہ "مونولاگ" شعیب خالق کا ایک ایسا افسانہ ہے جس میں میں شعیب خالق نے احساس تنہائی کی کیفیت کو مختلف انداز میں پیش کیا ہے۔ جدید معاشرے کے اندر احساس تنہائی کی کیفیت اس وقت پیدا ہوتی

ہے جب ایک فرد دوسرے فرد کو وقت نہیں دہ سکتا تو اسے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس کی حیثیت ایک شئے کی مانند ہو گئی ہے۔ یہی کیفیت فرد کو نفسیاتی کشمکش میں مبتلا کر دیتی ہے۔ "مونولاگ" افسانے کا مرکزی کردار "نصرت علی چیمہ" کا ہے جو اپنی ذہانت کی بدولت اپنے گھریلو حالات بہتر بنالیتا ہے۔ دیانت داری اور محنت کی لگن کی وجہ سے ترقی کر کے ایک بڑا آدمی بن جاتا ہے مگر ایک دن اچانک ہی اس کے ذہن میں خیال آتا ہے کہ عمر کے اس حصّے میں اس کو آرام کرنا چاہیے تو وہ کاروبار سے علیحد گی کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ بیٹی کی شادی اور بیٹے کی بے جامصروفیت کے باعث اس کے اندر احساس تنہائی کی کیفیت آہستہ آہستہ پیدا ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ کاروبار سے علیحدہ ہونے کے باعث وہ تمام وقت گھر میں گزار دیتا ہے۔ بیٹی کے رخصت ہونے کے بعد اور بیٹے کی بے جا مصروفیت کے باعث گھر میں کوئی بھی اس کو وقت نہیں دے سکتا۔ وقت گزاری کے لیے وہ ٹی وی کا سہارا بھی لیتا ہے مگر جب وہ ان ٹی وی چینل کے لوگوں کو اکھٹا بیٹھتا ہوا دیکھتا ہے تو اس کے اندر رنج پیدا ہوتا ہے کہ اس کی حیثیت اب ایک بے جان چیز کی ہو گئی ہے۔

> "تعلیم یافتہ کلچر سے آراستہ اولاد میں بڑی بیٹی اور ایک بیٹا، اپنے حال اور مستقبل کی چمک اور کمپوٹرانہ لپک لیے پروان چڑھے۔ بیٹی سے گہری محبت اس کی شادی اور امریکہ رخصتی کے ساتھ ہی جیسے چھپ چھپ کر روتے ہوئے سطح پر آگئی اور پھر بیٹا بھی جب بیوی گھر لے آیا تو وہ بھی باپ کی خشک آنکھوں میں ڈوبا اور سامنے ہوتے ہوئے بھی کہیں گم ہو گیا۔"(۶۱)

کاروباری زندگی سے علیحد گی کے باعث جب اس نے سوچا کہ اب وہ آرام کرے گا۔ مگر بچوں کی دوری کے باعث جب وہ اکیلا تنہا گھر میں رہنے لگا تو اس کے اندر احساس تنہائی کی کیفیت اجاگر ہونے لگی۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے کسی کو بھی اس کی ضرورت نہیں رہی ہے۔ اس کا وجود ایک بے کار شئے کی مانند ہو گیا ہے۔

افسانے کا مرکزی کردار "چیمہ" جو زندگی کی رنگا رنگی میں آرئش وزیبائش میں زندگی بسر کر رہا تھا۔ اس نے تمام تر کمائی دولت اور آسائش کی وجہ سے زندگی میں تمام چیزوں کا ذائقہ چکھا، اس سے لطف اندوز ہوا مگر گھر والوں کی لاتعلقی کی وجہ سے اس کی زندگی کے رنگ آہستہ آہستہ پھیکے پڑنا شروع ہو گئے۔ اس کے ارد گرد بہت سے لوگ ہونے کے باوجود بھی وہ خود کو تنہا محسوس کرنے لگا۔

> "پینسٹھ سالہ عمر کی تمام تر کمائی دولت وآسائش کی بے معنویت اور آخرت کی تشکیک

بھی اس کی روح کو جیسے جھلسائے ہوئے تھی۔اس نے زندگی کا جو بھی خواب دیکھا اور چکھا اس خواب کا تعبیری ذائقہ اب زندگی کا پھیکا پن بن کر اس کی رگوں میں سرایت کیے جارہا تھا۔"(۶۲)

احساس تنہائی کی کیفیت عمر رسیدہ افراد میں زیادہ تر پائی جاتی ہے۔کیونکہ اس عمر میں فرد دوسروں کی توجہ حاصل کرنا چاہتا ہے لیکن اس کی زندگی کے تمام رنگ اس وقت پھیکے پڑھ جاتے ہیں۔

شعیب خالق اپنے اس افسانے میں جدید معاشرے کے فرد کے مسائل سے جڑے ایک اہم مسئلے کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ جدید معاشرہ میں افراد ٹی وی کی خبروں سے اپنا وقت گزارنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن حقیقت میں یہ ٹی وی ایسا مسئلہ ہے جس نے جدید معاشرہ کے افراد کی زندگیوں میں بے سکونی پیدا کر دی ہے۔اس سے وہ طرح طرح کے مسائل جیسے داخلی تنہائی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔داخلی تنہائی کی بدولت ہی فرد اپنی توجہ مرکوز کرنے کے لیے ٹی وی اور اخباروں کا سہارا لیتا ہے۔لیکن اس جدید دور کے اندر ٹی وی سکرین پر بھی سیاسی کارکنوں کی لڑائی، ٹاک شوز پروگرامز، ریموٹ بم دھماکے اور غربت کے ہاتھوں خود کو آگ کی نظر کرتی ہوئی زندگی جیسے پروگرام نشر کیے جاتے ہیں۔احساس تنہائی کا شکار فرد جب ان پروگرامز کو دیکھتا ہے تو اس کے اندر نفسیاتی کشمکش کی صورتحال پہلے سے زیادہ فروغ پارہی ہوتی ہے۔ان تمام صورتحال سے دوچار افراد مونولاگ جیسی کیفیت سے بھی دوچار ہو جاتے ہیں۔وہ اپنی بات دوسروں تک بیشک منتقل نہیں کر سکتے مگر من ہی من میں خود کلامی کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔اس کی عکاسی شعیب خالق نے اپنے افسانے کے اندر یوں کی ہے:

"ٹی وی سکرین پر خود کش حملے، ٹارگٹ کلنگ، ریموٹ بم دھماکے اور غربت کے ہاتھوں خود کو آگ کی نظر کرتی ہوئی زندگی کی بے توقیری نے اس کے مونولاگ میں آہستہ آہستہ تلخی بڑھانا شروع کر دی۔پھر ایک دن اچانک وہ خود ہی اپنی خود کلامی سے چونک اٹھا۔اسے اپنے بارے میں نیم آسیبی سا احساس ہونے لگا۔جیسے اس کے خاموش ہونٹ لوگوں کو ہلتے ہوئے دکھائی دینے لگتے ہیں۔"(۶۳)

انسان کے اندر خود کلامی کی کیفیت دوسرے انسانوں کی لاپرواہی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔کیونکہ انسان جب اپنے جذبات اور احساسات دوسروں تک منتقل نہیں کرتا تو وہ اندر ہی اندر زنگ آلود ہوتا جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ انسان کے اندر خود کلامی کی کیفیت ابھر آتی ہے۔

"غالباً بیٹے نے باپ کو کچھ وقت دینا، اسے باہر کھانے پر لے جانا۔۔۔ڈاکٹر کی تاکید ہی بجالاتے ہوئے نبھایا۔۔۔ مگر جلد ہی بچے واپس اپنی روٹین میں الجھ گئے۔۔۔بیٹی بھی امریکہ سے دوڑی آئی اور باپ کی خدمت و محبت نبھائی۔ آخر میں بھائی اور ماں کو یہ کہہ کر واپس چلی گئی پاپا کو کچھ بھی نہیں ہوا بس ان کا خیال رکھیں اور انہیں وقت دیا کریں۔"(۶۴)

احساس تنہائی کی کیفیت فرد کے اندر اس وقت پروان چڑھتی ہے جب ارد گرد میں بہت سے لوگ ہونے کے باوجود بھی انسان خود کو تنہا محسوس کرتا ہے۔ مختلف لوگوں کی توجہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ وہ انہیں اپنی جانب مائل کرنا چاہتا ہے۔ مگر جب گھر والے اس فرد کو وقت دیتے ہیں تو اس کے اندر احساس تنہائی کی کیفیت ختم ہو جاتی ہے۔ مگر عمر رسیدہ افراد کو گھر والوں کے وقت کی خاص طور پر ضرورت ہوتی ہے۔ جس طرح اس افسانے کا مرکزی کردار گھر والوں کی لاپرواہی کی وجہ سے احساس تنہائی کا شکار ہو جاتا ہے مگر جب وہی بچے اسے مکمل وقت اور توجہ دیتے ہیں تو وہ ایک نارمل زندگی بسر کرنا شروع کر دیتا ہے۔

شعیب خالق نے اپنے اس افسانے میں ایک اور اہم نقطے کی طرف اشارہ کیا ہے جس کی بدولت جدید معاشرے کا فرد آج بھی مسائل سے دوچار ہو رہا ہے۔ جدید معاشرے کے اندر سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ انسان حقائق کا سامنے کرنے کی بجائے آج بھی اپنے مسائل کا حال پرانے اور فرسودہ طریقے سے ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہے۔ مصروفیت کے باعث ایک دوسرے کو وقت نہیں دے پا رہا ہے مگر پرانی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے پیر مریدی اور تعویذ گنڈوں میں اپنے مسائل کا حل تلاش کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ حالانکہ ان مسائل کا حل خود انسان کے اپنے پاس موجود ہوتا ہے۔ جس طرح افسانے کا مرکزی کردار "چیمہ" کی بیوی اپنے شوہر کی بگڑتی حالت دیکھ کر اس کو وقت دینے کی بجائے پیروں سے تعویذ لا کر اور پانی بھی دم کروا آتی ہے تاکہ اس کا شوہر ٹھیک ہو جائے مگر وہ اور اس کے بچے اس کو وقت نہیں دے سکتے جس کی حقیقت میں اس کو ضرورت تھی۔ لیکن ان تمام امور کے باوجود بھی اس کے حالات دن بدن خراب ہوتے جارہے تھے۔

"بیوی شوہر کی بگڑتی ذہنی حالت کے سنبھلاؤ کی خاطر ایک دو زیارتوں پر بھی گئی اور دعا کے علاوہ تعویذ اور دم کیا پانی بھی لائی۔ اسے بہانے سے پلایا۔ مگر حالت سدھرنے کی بجائے ہر گزرتے دن کے ساتھ زیادہ گھمبیر ہوتی چلی گئی۔"(۶۵)

احساس تنہائی کی کیفیت میں اضافہ کرنے والے اسباب آپنوں کی لاپرواہی ہے۔ جدید معاشرے کے

اندر بھی لوگ اپنے مسائل کو حل کرنے کے لیے پیر مریدوں کے پاس جاتے ہیں۔ لیکن انہیں احساس تک نہیں ہوتا کہ نفسیاتی مریض اور احساس تنہائی کا مریض بنانے والے اپنے ہی دوست احباب اور رشتہ دار ہوتے ہیں۔ ان ہی رشتہ داروں کی لاپرواہی کی بدولت فرد احساس تنہائی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

ساٹھ کی دہائی کے بعد سماجی اور سیاسی مسائل منظر عام پر آئے۔ جدید دور کا آغاز ہونے کے باوجود بھی نئے مسائل نے سر اٹھایا۔ ملکی سطح پر سیاسی، سماجی اور اقتصادی مسائل مشکل ترین حالات سے دوچار تھے۔ اس طرح ساٹھ کی دہائی کے بعد فرقہ وارانہ فسادات، خود غرضی، بدامنی اور مفاد پرستی نے ملکی فضا کو براہ راست متاثر کیا۔ جنس، گھٹن اور خود غرضی نے ملک کی اجتماعی صورتحال کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ایسے حالات میں فرد کو داخلی حالت زار جیسی کیفیت کا سامنا کرنا پڑا۔

ابتدائی چند دہائیوں میں ہی جدید معاشرے کا فرد تعلیم و تربیت کی رکاوٹ، کم سنی کی شادی اور دیگر مسائل سے دوچار ہوا۔ جس کی وجہ سے جدید معاشرے کا فرد ذہنی دباؤ اور جسمانی پابندیوں کا شکار ہوا۔ فرد کے داخلی مسائل کا باعث بننے والا جاگیردرانہ نظام ہے جس کی وجہ سے سماجی روائیوں میں دوہرے معیارات نظر آتے ہیں۔ ہر انسان اپنے ماحول سے وابستہ اور مختلف رشتوں سے جڑا ہوا ہوتا ہے۔ چند حساس طبیعت کے مالک لوگ اپنے ماحول اور ارضی رشتوں سے جڑے ہوتے ہیں۔ حادثات و سانحات براہ راست اور واضح انداز میں حساس طبیعت کے مالک لوگوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ادب کی دیگر اصناف کی طرح فکشن کے اندر بھی داخلی خارجی زندگی کے بے شمار مناظر موضوع بنتے ہیں۔ جغرافیائی ماحول، تہذیب و ثقافت، تخیل و رومان، احساسات و جذبات غرض انسانی زندگی کے ہر پہلو کسی نہ کسی صورت میں فکشن کا موضوع بنتے ہیں۔

شعیب خالق کی بھی ہر کہانی کا رنگ اور ذائقہ جُدا جُدا ہے۔ اس وجہ سے ان کا رنگ بھی دوسرے تخلیق کاروں سے مختلف ہے۔ شعیب خالق نے تخلیقی کاوشوں کی بدولت فرد کے داخلی مسائل کو اجاگر کیا ہے اور قارئین کی توجہ مبذول کروانے کی کوشش کی ہے۔ داخلی مسائل کی وجہ ان کا افسانوی مجموعہ "بے حرف لفظ" نے مرکزی کردار ادا کیا ہے۔ ان کی تحریریں اچھوتی تحریریں ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۸ء، ص ۱۰۴

۲۔ ایضا، ص ۱۰۹

۳۔ انور جمال، پروفیسر، ادبی اصطلاحات، نیشنل بک فاونڈیشن اسلام آباد، ۲۰۱۲ء، ص ۹۷

۴۔ ایضا، ص ۱۰۹

۵۔ شعیب خالق، بے حرف لفظ، ص ۱۳

۶۔ نجیبہ عارف، ڈاکٹر سے راقم کا انٹرویو، بمقام البیرونی بلاک، بین الاقوامی اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد، بتاریخ ۴ مارچ ۲۰۲۰

۷۔ نوشیلہ انجم، شعیب خالق کے افسانے بے حرف لفظ اور ناولٹ آنٹی کا فنی اور فکری جائزہ، ص ۶۴

۸۔ شعیب خالق، خلیے پر لکھی تحریر، مشمولہ بے حرف لفظ، ص ۲۳

۹۔ ایضا، ص ۲۳

۱۰۔ نوشیلہ انجم، شعیب خالق کے افسانے بے حرف لفظ اور ناولٹ آنٹی کا فنی اور فکری جائزہ، ۲۰۰۹ء، ص ۶۵

۱۱۔ خالد سہیل، مذہب، سائنس، نفسیات، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۸ء، ص ۱۱۲

۱۲۔ شعیب خالق، نقطے کا سفر، مشمولہ بے حرف لفظ، ص ۲۹

۱۳۔ خالد سہیل، مذہب، سائنس، نفسیات، ص ۱۲۹

۱۴۔ القرآن، سورۃ الذاریات، آیت نمبر ۵۶، ترجمہ شدہ، مفتی تقی عثمانی، آسان ترجمہ قرآن، مکتبہ معارف القرآن، کراچی، ۲۰۱۷

۱۵۔ القرآن، سورۃ العلق آیت نمبر ۲، ترجمہ شدہ، مفتی تقی عثمانی، آسان ترجمہ قرآن، مکتبہ معارف القرآن، کراچی، ۲۰۱۷

۱۶۔ نوشیلہ انجم، شعیب خالق کے افسانے بے حرف لفظ اور ناولٹ آنٹی کا فنی اور فکری جائزہ، ص ۶۷

۱۷۔ شعیب خالق، وائجر ٹو، مشمولہ بے حرف لفظ، ص ۳۷

۱۸۔ شعیب خالق، بے چہرہ زندگی، مشمولہ بے حرف لفظ ص ۵۹

۱۹۔ یاسمین فاطمہ، جدید اردو افسانے میں عصری حیثیت، مکتبہ شعر و حکمت، ۱۹۸۷ء ص ۷۶

۲۰۔ نوشیلہ انجم، شعیب خالق کے افسانے بے حرف لفظ اور ناولٹ آنٹی کا فنی اور فکری جائزہ، ص ۸۷

۲۱۔ شعیب خالق، ڈور، مشمولہ بے حرف لفظ، ص ۶۷

۲۲۔ اظہار اثر، آج کی سائنس، اردو اکادمی، دہلی، ۲۰۰۶ء، ص ۶۵

۲۳۔ نوشیلہ انجم، شعیب خالق کے افسانے بے حرف لفظ اور ناولٹ آنٹی کا فنی اور فکری جائزہ، ص ۶۵

۲۴۔ اندر جیت لال، سائنس کی باتیں، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۲ء، ص ۱۱۱
۲۵۔ شعیب خالق، نقطے کا سفر، مشمولہ بے حرف لفظ، ص ۲۹
۲۶۔ ایضا، ص ۲۹
۲۷۔ شعیب خالق، دوہر از ہر، مشمولہ بے حرف لفظ، ص ۹۷
۲۸۔ نوشیلہ انجم، شعیب خالق کے افسانے بے حرف لفظ اور ناولٹ آنٹی کا فنی اور فکری جائزہ، ص ۸۵
۲۹۔ شعیب خالق، دوہر از ہر، مشمولہ بے حرف لفظ، ص ۹۹
۳۰۔ نوشیلہ انجم، شعیب خالق کے افسانے بے حرف لفظ اور ناولٹ آنٹی کا فنی اور فکری جائزہ، ص ۸۵
۳۱۔ شعیب خالق، خلیے پر لکھی تحریر، مشمولہ بے حرف لفظ، ص ۲۴
۳۲۔ نوشیلہ انجم، شعیب خالق کے افسانے بے حرف لفظ اور ناولٹ آنٹی کا فنی اور فکری جائزہ، ص ۶۹
۳۳۔ شعیب خالق، وائجر ٹو، مشمولہ بے حرف لفظ، ص ۳۶
۳۴۔ شعیب خالق، ڈور، مشمولہ بے حرف لفظ، ص ۶۷
۳۵۔ ابو الاعجاز حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، ص ۲۰۱
۳۶۔ شعیب خالق، ڈور، مشمولہ بے حرف لفظ، ص ۷۱
۳۷۔ قمر رئیس، مشمولہ ٹیڑھی لکیر میں نفسیاتی الجھنیں، از شیم رضوی عصمت چغتائی کی ناول نگاری ٹیڑھی لکیر کی روشنی میں، نیو پبلک پریس، دہلی، ۱۹۹۲ء، ص ۱۲۷
۳۸۔ شعیب خالق، مندرجہ ذیل، مشمولہ، چھتری نما کہانیاں، رمیل ھاوس آف پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۱۹ء، ص ۴۵
۳۹۔ یاسمین فاطمہ، جدید اردو افسانے میں عصری حیثیت، ص ۶۷
۴۰۔ شعیب خالق، مندرجہ ذیل، مشمولہ، چھتری نما کہانیاں، ص ۴۶
۴۱۔ ایضا، ص ۴۷
۴۲۔ ایضا، ص ۴۸
۴۳۔ ایضا، ص ۴۱
۴۴۔ ایضا، ص ۵۱
۴۵ صفیہ عباد، رشید امجد کے افسانوں کا فنی و فکری مطالعہ، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء، ص ۸۵
۴۶۔ شعیب خالق، بے حیرانگی، مشمولہ، چھتری نما کہانیاں، ص ۸۶

۴۷۔ شعیب خالق، مندجہ ذیل، مشمولہ، چھتری نما کہانیاں، ص ۵۰

۴۸۔ شعیب خالق، بس ایک سگریٹ، مشمولہ، چھتری نما کہانیاں، ص ۱۴۸

۴۹۔ شعیب خالق، بے حیرانگی، مشمولہ، چھتری نما کہانیاں، ص ۹۰

۵۰۔ شعیب خالق، مونولاگ، مشمولہ، چھتری نما کہانیاں، ص ۴۶

۵۱۔ صفیہ عباد، رشید امجد کے افسانوں کا فنی وفکری مطالعہ، ص ۸۴

۵۲۔ شعیب خالق، خلیے پر لکھی تحریر، مشمولہ بے حرف لفظ، ص ۲۴

۵۳۔ شعیب خالق، وائجر ٹو، مشمولہ بے حرف لفظ، ص ۳۵

۵۴۔ ایضا، ص ۶۱

۵۵۔ شعیب خالق، بے حیرانگی، مشمولہ، چھتری نما کہانیاں، ص ۸۶

۵۶۔ ایضا، ص ۸۶

۵۷۔ شعیب خالق، خلیے پر لکھی تحریر، مشمولہ بے حرف لفظ، ص ۲۴

۵۸۔ شعیب خالق، دوسرا سمندر، مشمولہ بے حرف لفظ، ص ۸۷

۵۹۔ شعیب خالق، ڈور، مشمولہ بے حرف لفظ، ص ۸۷

۶۰۔ شعیب خالق، ٹوٹ کر بچھڑنا، مشمولہ بے حرف لفظ، ص ۷۵

۶۱۔ شعیب خالق، مونولاگ، مشمولہ، چھتری نما کہانیاں، ص ۷۹

۶۲۔ ایضا، ص ۷۹

۶۳۔ ایضا، ص، ۸۱

۶۴۔ ایضا، ص، ۸۲

باب سوم:

شعیب خالق کے فکشن میں خارجی مسائل

فکشن کے ذریعے زندگی کے حقائق کو قارئین کے سامنے لایا جاتا ہے۔فکشن کے اندر کہانی آغاز سے انجام تک منتقل ہوتی ہے۔ کہانی کے آغاز سے اختتام تک قارئین کو بہم مسرت سے دو چار کیا جاتا ہے۔ موضوعاتی حوالے سے فکشن سیاسی، سماجی، نفسیاتی، مافوق الفطرت، معاشرے کے اندر فرد کے خارجی مسائل پر مشتمل ہے۔ فکشن کے اندر پلاٹ، کردار، مکالمے، جذبات نگاری، منظر کشی اور نظریاتی عکاسی ہوتی ہے۔

شعیب خالق کا شمار اکیسویں صدی کے لکھنے والوں میں شمار ہوتا ہے۔انہوں نے اپنی تحریروں میں انسانیت کی بھرپور حمایت کی ہے۔ وہ اس نظریے کے حامی ہیں کہ دنیا میں چاہے مرد ہو یا عورت ہو یا بچے ہر کسی کو جینے کا مکمل اختیار حاصل ہے۔ انھوں نے اپنے فکشن کے اندر اس نظریے کی پیشکش بھی کی ہے کہ جدید معاشرے کے اندر سماجی اور معاشرتی مسائل کا اگر خاتمہ ہو جائے تو ہر انسان بہتر زندگی بسر کر سکتا ہے۔ابو الاعجاز صدیقی رقمطراز ہیں:

"خارجیت کی اصطلاح خارج بینی اور خارجی زندگی سے فنکارانہ التفاتو اعتنا کے علاوہ اردو ادب میں ایک محدود معنوں میں بھی استعمال ہوتی ہے۔"(۱)

خارجیت داخلیت کے برعکس ہے۔ خارجیت باطن کی زندگی سے جڑی ہے، خارجیت میں ماحول، آئے روز کے واقعات اور معاملات زندگی فرد کی زندگی پر مثبت اور منفی دونوں طرح سے اثرات مرتب کرتے ہیں۔

ابو الاعجاز صدیقی رقمطراز ہیں:

"وہ اپنے کو خارجی دنیا میں داخل کرتا ہے۔اس طرح مختلف اشیا کی وہ عکاسی کرتا ہے مگر ایسا کرنے میں وہ اپنی شخصیت کو زیادہ تر دور رکھتا ہے۔"(۲)

اس طرح داخلیت کے برعکس خارجیت کا تعلق ظاہری سطح سے ہے تاہم داخل اور خارج لازم وملزوم ہیں دونوں ایک دوسرے سے متاثر ہوتے ہیں۔ داخلیت کا تعلق باطن اور داخلی کیفیت سے ہے۔ اس طرح باطن کے مسائل اس وقت معلوم ہو سکتے ہیں جب باطن کی دنیا سے آگاہی ہو۔ خارجیت کا تعلق باطن کی دنیا سے ہے اس لیے اس کا تعلق خارج سے ہے۔ تاہم داخلیت خارجیت پر اور خارجیت داخلیت پر اپنے اثرات مرتب کرتی ہے۔

پروفیسر انور جمال رقمطراز ہیں:

"خارجیت داخلیت کی ضد ہے۔۔۔ زندگی کی بیرون سطح دیکھتا ہے۔ پیکر محبوب کی

قصیدہ خوانی، ظاہر بینی، محفل آرائی، انجمن پسندی، نشاطیہ لہجہ۔ وغیرہ خارجیت کے عناصر ہیں۔"(۳)

خارجی معاملات سے متاثر جدید معاشرے کے افراد مسائل کا شکار ہیں۔ شعیب خالق نے اپنے فکشن میں جہاں دیگر موضوعات کو شامل کیا ہے وہاں ان کے فکشن میں جدید معاشرے کے افراد کے خارجی مسائل بھی شامل ہیں جن پر شعیب خالق نے توجہ مبذول کروانے کی کوشش کی ہے۔ شعیب خالق کا شمار اکیسویں صدی کے لکھنے والوں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے معاشرتی اصلاح کے ساتھ ساتھ فروغ تعلیم کی بھی حمایت کی اور معاشرتی مسائل کی جانب توجہ بھی مبذول کروائی۔ شعیب خالق نے اپنے نظریات کی ترسیل پیشکش کے لیے افسانے اور ایک ناولٹ تحریر کیا۔ مصنف اپنے نظریات اپنے گردونواح سے اخذ کر کے انہیں ادب میں پیش کرتا ہے۔ اپنے فکشن کے اندر جدید دور کے معاشرے کی حقیقی تصویر کشی کرتے ہوئے وہ ان تصاویر میں یوں رنگ بھرتے ہیں کہ تمام تر احوال قارئین کے ذہن پر نقش ہو جاتے ہیں۔ شعیب خالق سماجی اور اصلاحی کاموں کے سرگرم رکن ہیں ان کی تحریروں میں اس کی پیشکش واضع طور پر نظر آتی ہے۔ شعیب خالق نے اپنے فکشن میں معاشرے کی تصویر کشی کرتے ہوئے موجودہ دور کے تمام تر مسائل سے پردہ اٹھایا ہے اور پھر ان مسائل کے سدباب کی کوشش کی ہے اور ساتھ ساتھ سماجی مسائل کا مناسب حل بھی پیش کیا ہے۔

زیر نظر تحقیق شعیب خالق کے فکشن پر کی گئی ہے۔ دو افسانوی مجموعے "بے حرف لفظ" اور "چھتری نما کہانیاں" اور ناولٹ "آنٹی" میں فنکارانہ انداز میں معاشرے میں فرد کے خارجی مسائل کو مد نظر رکھ کر مسائل کو اجاگر کیا ہے۔ ان کے فکشن کے موضوعات ایسے ہیں جن کو پڑھ کر یوں لگتا ہے کہ ان کے پاس اپنے ماحول اور سماج کے عصری مسائل کے مشاہدے کی بے پناہ قوت موجود ہے ان کی تحریروں سے ان کے تجربات اور مشاہدات کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔

فکشن کے اندر شعیب خالق نے بہت سارے موضوعات پر قلم اٹھایا ہے جہاں انھوں نے دیگر موضوعات کی عکاسی کی ہے وہاں ان کے فکشن کا ایک اہم پہلو جدید معاشرے کے فرد کے خارجی مسائل بھی ہیں۔ جہاں انھوں نے ان مسائل کی جانب توجہ مبذول کروانے کی کوشش کی ہے وہیں انھوں نے قارئین کے سامنے ان مسائل کو اس انداز سے پیش کیا ہے کہ ان کی اصلاح کی جا سکے۔ فکشن میں معاشرے کے اعلی متوسط طبقے کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ تعلیم یافتہ اور اَن پڑھ دونوں طرح کے کردار پیش کیے گئے ہیں اور یہ اُجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ پڑھا لکھا انسان ہی معاشرے کا بہتر اور پروقار فرد بن سکتا ہے۔ معاشرے کے

اندر مثبت تبدیلی لانے کا باعث بھی مثبت ہے۔ جبکہ ایک اَن پڑھ انسان معاشرے کے اندر بوجھ ہوتا ہے۔ لیکن بعض اوقات خارجی مسائل بھی فرد کو بیشتر مشکلات میں گھیرے رکھتے ہیں۔ شعیب خالق نے اپنے فکشن کے اندر ان مسائل کی جانب توجہ مبذول کروائی ہے۔

شعیب خالق کی کہانیوں میں موضوعاتی تنوع پایا جاتا ہے انھوں نے فکشن کے اندر معاشرے کے مختلف مسائل پر قلم اٹھایا ہے۔ موضوعاتی دائرہ وسیع ہونے کی وجہ سے ان کے افسانوں کے کردار معاشرتی حقیقتوں کی عکاسی کر رہے ہیں۔ شعیب خالق نے بڑی مہارت اور چابکدستی سے انسانی نفسیات کو اپنی کہانی کا حصّہ بنایا ہے۔ اپنے فکشن کے اندر تکنیکی طور پر اجتماعی اور انفرادی خود کلامی سے بہت زیادہ کام لیا ہے۔ اجتماعی اور انفرادی خود کلامی نے مظلوموں کی آواز بلند کی ہے۔

موضوعاتی حوالے سے شعیب خالق کے فکشن میں جدید معاشرے کے فرد کو درپیش داخلی اور خارجی مسائل کو اجاگر کیا گیا ہے۔ ان کی کہانیوں میں جدید معاشرے کے اندر بھی مختلف قسم کے مسائل اس انداز سے پیش کیے گئے ہیں کہ اس سے جدید معاشرے کے فرد کے احساسات اور جذبات کی ترجمانی کی گئی ہے۔ شعیب خالق نے ان رازوں سے بھی پردہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔

شعیب خالق کا ناولٹ "آنٹی" ان کا پہلا ناولٹ ہے جو ۲۰۰۱ء میں شائع ہوا۔ اس ناولٹ کا موضوع انتہائی سنجیدہ ہے "آنٹی" لفظ کو علامتی انداز سے استعمال کر کے انسانی تہذیب کی عکاسی کی گئی ہے۔ اس ناولٹ کے ذریعے انسان کی اصلیت سے نقاب اتارنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جس سے انسان کی اصل فطرت سامنے آتی ہے۔ انسان اپنی اصلیت کو چھپانے کے لیے ہر حربے کو استعمال کرتا ہے وہ کبھی بھی اپنا آپ دوسرے کے سامنے نہیں لاتا۔ اسی کی عکاسی اس ناولٹ کی کردار "عابدہ" کے ذریعے کی ہے۔

> "ہائے اللہ میں مری، اچانک کچھ یاد آجانے پر وہ گھبرا گئی۔ میں توے پر روٹی ڈال رہی تھی تمہاری کھانسی کی آواز سنی، قسم سے روٹی جل گئی ہوگی۔ پھر وہ عجلت میں جاتے ہوئے بولی بچوں کو کھانا کھلاؤں گی تو وہ سوئیں گے اور پھر میں آؤں گی دس بجے، اچھا وہ جلدی سے دروازے میں داخل ہوئی اور صحن میں اترنے تک پیچھے مڑ کر دیکھتی رہی۔
> "(۴)

شعیب خالق نے اپنے ناولٹ کے اندر مختلف کرداروں کے ذریعے انسان کی ظاہری اور باطنی کیفیات کو ان کی نفسیات کے ساتھ پیش کیا ہے۔ سادہ خوبصورت اور واضح جملوں کا سہارا لے کر مصنف نے انسانی

نفسیات کو قاری کے سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ ان کی تحریر قاری کی توجہ اور دلچسپی کا مرکز بن جاتی ہے کیونکہ مصنف نے جا بجا طور پر اپنے ناولٹ کے اندر تجسس کو پیدا کیا ہے کہ ناولٹ کے اختتام تک قاری کے لیے توجہ کا مرکز رہتا ہے۔

شعیب خالق نے اپنے ناولٹ "آنٹی" کے حوالے سے کہا:

> "ناولٹ آنٹی" کو میں نے سچائی کے ساتھ لکھ دیا ہے۔ میں جو کچھ کہنا چاہتا تھا اور جو میں محسوس کر رہا تھا۔ اس کو میں نے اپنے ناولٹ کے اندر تحریری صورت میں پیش کر دیا۔ میں نے انسانی نفسیات کو جیسے محسوس کیا میں نے اس کو احاطہ تحریر میں لایا ہے۔ اب میں اس میں میں کتنا کامیاب ہوا ہوں یہ آپ نے طے کرنا ہے۔"(۵)

ناولٹ "آنٹی" میں شعیب خالق نے خوبصورت انداز سے منظر نگاری اور واقعات نگاری کی ایسی تصویر کشی کی ہے کہ اس سے مصنف کی تحریر میں پختگی کا ثبوت ملتا ہے۔

نوشیلہ انجم لکھتی ہیں:

> "اس ناول پر رومانی رنگ بھی غالب نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ ناول کا بیانیہ انداز، منظر نگاری اور واقعات کا بیان وغیرہ پر رومانیت کا رنگ غالب نظر آتا ہے ۔ جذبے احساسات اور محبت میں ڈوبے الفاظ اسے خاص قسم کی دلکشی عطا کرتے ہیں ۔ گویا مصنف اس ناول سے قاری کو غور و فکر کی دعوت دیتا نظر آتا ہے۔ اس ناول میں مصنف نے نہایت خوبصورت اور دلچسپ جملے استعمال کیے ہیں جو مصنف کی تحریر میں پختگی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔"(۶)

روایتی انداز میں لکھی گئی ناولٹ کی کہانی ہمارے معاشرے کے افراد کی چلتی پھرتی کہانی ہے۔ شعیب خالق نے بڑے فنکارانہ انداز میں اپنی ذاتی بصیرت، مشاہدے، اپنے علم اور فن کے ذریعے سماجی حقیقت کو اجاگر کیا ہے۔ کہانی کے دوران نقطہ عروج تک پہنچنے اور اختتام تک شعیب خالق نے احسن انداز میں کہانی کو پروان چڑھایا ہے کہ کہانی کے اختتام ہونے کے بعد قارئین سوچ و بچار میں مبتلا رہتا ہے۔

پہلے پہل لوگوں کا خیال ہوتا تھا کہ انسان کو رہتے گناہوں کی سزا اگلے جہاں میں ملے گی لیکن اب خدا کی ذات اس جہاں میں ہی انسان کو پکڑ میں لے کر اس کے گناہوں کی سزا دے دیتی ہے۔ اسی کی عکاسی مصنف نے اپنے ناولٹ میں بھی کی ہے کہ انسان کو اپنے گناہوں کا حساب مرنے سے پہلے ہی اس جہاں میں دیتا ہے۔

اسی پہلو کی عکاسی مصنف نے ناولٹ کے آخری حصّے میں کی ہے۔ مصنف لکھتا ہے:

"نیلی چھتری والا ہر وقت دیکھ رہا ہے۔ انسان اس سے چھپ نہیں سکتا اور نہ اپنے راز اس سے چھپا سکتا ہے۔ دنیا کے اندر انسان جو مرضی کرتا ہے اس کے ہر عمل و فعل پر اس کی نظر ہوتی ہے خدا کی پکڑ بہت سخت ہے۔"(۷)

ناولٹ "آنٹی" شعیب خالق کی دوسری کتاب ہے۔ ۱۹۹۰ء میں ناولٹ سے پہلے ان کا ایک افسانوی مجموعہ "بے حرف لفظ" کے نام سے منظر عام پر آیا اور ناولٹ کے بعد اس طرح ان کی تیسری کتاب "چھتری نما کہانیاں "۲۰۱۹ء میں منظر عام پر آئی۔ ان کی تحریروں میں جذبات، احساسات، محبت سے بھرے الفاظ اور رومانوی رنگ غالب نظر آتا ہے۔ مصنف دلچسپ جملوں اور خوبصورت لفظوں کے ذریعے قارئین کو سوچ بچار کی دعوت دیتا ہے۔ جن کے ذریعے معاشرے میں فرد کے خارجی مسائل سامنے آتے ہیں۔ مصنف قارئین کو ان مسائل کی طرف توجہ مبذول کروانے کی کوشش کرتا ہے۔ جو آج کے جدید معاشرے کے اندر فرد کو درپیش ہیں۔ مشینی ترقی سے بظاہر انسان نے ترقی کی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کے مسائل میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ انسان کی قدر و منزلت مشینوں کی بدولت کم ہو گئی ہے۔ جو کام دس آدمی مل کر کرتے تھے اب ایک مشین کرنے لگی ہے اور وہ بھی کم وقت میں۔ آج فرد پہلے سے زیادہ مسائل میں مبتلا ہو چکا ہے۔ مصنف نے اپنی تحریروں کے ذریعے فرد کے مختلف مسائل کو اس انداز سے اُجاگر کیا ہے جو مصنف کی تحریر میں پختگی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

انسانی اعضاء کی سمگلنگ:

"شعیب خالق کا افسانہ "ایک نوکر کی کہانی" ایسا افسانہ ہے جس میں جدید معاشرے کے فرد کو درپیش ایک اہم مسئلے انسانی اعضاء کی سمگلنگ کا ذکر ملتا ہے۔ انسانی اعضاء کی سمگلنگ، زندگی کی ضروریات اور اشیائے خورد و نوش کی ایک ملک سے دوسرے ملک سمگلنگ کی جاتی ہے۔ سمگلنگ کا نظام ملکی معیشت کو بہت نقصان پہنچاتا ہے کیونکہ سمگلنگ غیر قانونی طریقے سی کی جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے سامان کی مقدار اور قیمت کم ہو جاتی ہے۔ اس طرح دوسری اشیاء کی نسبت سمگلنگ کا سامان زیادہ سستا ہوتا ہے۔ ملکی معیشت بھی تباہ ہوتی ہے لوگ بھی مہنگائی، بے روزگاری اور دیگر مختلف وجوہات کی بنا پر سستی اور کم معیاری چیزیں لینے کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس طرح قانونی راستوں میں بھی کسٹم والوں کو رشوت یا سفارش سے بھی سامان بھیجا جاتا ہے۔ یہ بھی سمگلنگ کرنے کی بدولت ہے۔

اشیاء اور دیگر چیزوں کی سمگلنگ کے علاوہ انسانی اعضاء اور انسانوں کی بھی سمگلنگ کی جاتی ہے۔ انسانی اعضاء میں گردوں، دل، آنکھیں اور دیگر اعضاء کی سمگلنگ کی جاتی ہے۔ اور یہ ایک غیر فطری اور ظلمانہ رویہ ہے کیونکہ دنیا کے اندر انسانی وجود کی بہت اہمیت ہے لیکن سمگلنگ کے نظام نے انسانی وجود کی اہمیت کو ختم کر کے پیسوں کو اہمیت دی ہے۔ سمگلنگ کی زد میں غیر قانونی طور پر انسانی اعضاء کو دوسرے ممالک میں بھیجا جاتا ہے۔ یہ بہت ہی بڑا ظلم اور فطرت کی خلاف ورزی ہے۔ اس کی زد میں آنے والے انسان اور انسانی اعضاء کی سمگلنگ کے واقعات نہایت شرمناک حد تک بڑھ چکے ہیں۔ معاشرے کے اندر بدامنی، غربت، اور بے روزگاری بڑھ رہی ہے۔ سمگلنگ کے بڑے رجحان کی وجہ سے ملکی معاشی ترقی کا عمل بھی رک گیا ہے۔ کیونکہ سمگلنگ کی وجہ سے کارخانے اور پیداوار کے ذرائع کو شدید نقصان پہنچتا ہے۔ اس وجہ سے ملک کا اقتصادی نظام درہم برہم ہو کر رہ جاتا ہے۔

شعیب خالق نے بھی اپنے فکشن کے اندر انسانی اعضاء کی سمگلنگ کے حوالے سے قلم اٹھایا ہے۔ شعیب خالق ایک جدید فکشن نگار ہے۔ انھوں نے اپنے فکشن کے اندر جہاں دیگر موضوعات کو پیش کیا ہے۔ وہیں انھوں نے انسانی اعضاء کی سمگلنگ کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کروانے کی کوشش کی ہے۔ بظاہر یہ مسائل معمولی نظر آتے ہیں لیکن سمگلنگ کی وجہ سے ملک کی معیشت، اقتصادی نظام اور معاشی ترقی پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اسی کی عکاسی شعیب خالق نے اپنے افسانے "ایک نوکر کی کہانی" میں کی ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار "شہباز" کا ہے۔ "شہباز" جو اپنے والدین کے معاشی حالات بہتر کرنے کے لیے صرف ہزار روپے کی تنخواہ لے کر بھاری امور انجام دینے کی کوشش کرتا ہے۔ "شہباز" کا والد جس کا ایک گردہ سمگل کی زد میں ہو گیا لیکن اس کے باوجود ان کے معاشی حالات بہتر نہ ہو سکے۔ شعیب خالق اپنے اس افسانے میں غربت میں پھنسے ہوئے لوگوں کی عکاسی کی ہے۔ غربت میں پسا ہوا "شہباز" کا والد ایک گردے سے محروم ہو کر بھی حالات میں بہتری نہ لا سکا۔ سمگلنگ کی عکاسی افسانے میں گردے کے فروخت کے ذریعے نظر آتی ہے۔ اپنے بیٹے کی خاطر غریب والدین اپنے گردے بھی بیچ دیتے ہیں۔

> " گوانڈ میں کوئی قتل ہوا اور اس میں میرے وڈے پتر کا ناں مقدمے میں ڈالا دیا۔ کھوتا کڈی وی گئی زمین وی گئی، عدالت توں لے کر جہل تک میرا اور میری گھر والی کا ایک ایک گردہ وکیل کچہری کے رزق میں نکل گیا۔ "(۸)

والدین اپنے معاشی حالات اور اپنی اولاد کی خاطر اپنے گردے تک کو فروخت کر دیتے ہیں لیکن

غربت میں پسے ہوئے لوگوں کے حالات پھر بھی بہتر نہیں ہو سکتے۔

سمگلنگ کے حوالے سے شعیب خالق نے اس کی عکاسی یوں کی ہے کہ سمگلنگ کی زد میں تعلیمی شعور کی کمی اور غربت میں پسے دیہاتی شکار ہوتے ہیں۔

"کسی بھی دوسرے ملک میں گردے سمگل کرنے والا کوئی سرجن قصائی بھی اپنی تجوری میں چند لاکھ فی گردہ ڈال رہا ہے مجبور ولاچار سادہ لوح دیہاتی اپنے چھوٹے چھوٹے خوابوں اور تمناؤں کے حصول میں گردہ فروشی تک نکل آتے ہیں۔"(۹)

چائلڈ لیبر:

شعیب خالق کا افسانہ "بس ایک بسکٹ" میں چائلڈ لیبر کے موضوع کے حوالے سے ذکر موجود ہے۔انھوں نے جدید معاشرے میں درپیش اس اہم مسئلے کی طرف توجہ دلوائی ہے۔بچے ہر ملک کا سرمایہ ہوتے ہیں۔آج کے بچے کل کے مستقبل ہوتے ہیں لیکن ان غریب طبقوں کے بچوں کو کوئی دو وقت کی روٹی بھی نہیں دے سکتا۔غریب والدین اپنے معاشی حالات سے تنگ آکر اپنے بچوں کو کام پر لگا دیتے ہیں۔ان سے کم عمری میں بھی مشقت کروائی جاتی ہے۔چائلڈ لیبر کی وجہ سے معاشرے کے اندر خارجی مسائل کو فروغ ملتا ہے۔اس کی عکاسی شعیب خالق نے اپنے افسانے "بس ایک بسکٹ" میں کی ہے اس افسانے کا مرکزی کردار "ظہور" کا ہے جس کے والدین اپنے مالی حالات سے تنگ آکر "ظفر" کے ساتھ "ظہور" کو شہر بھیج دیتے ہیں۔وہ دن بھر گھر کے کام بھی کرتا ہے اور چھوٹے صاحب کی خدمت اور خیال بھی کرتا ہے اور بدلے میں اسے صرف ہزار روپے مہینہ دیا جاتا ہے اور سارہ کام نیک نیتی سے کرنے کے باوجود بدلے میں صرف تھپڑوں سے نوازا جاتا ہے اس کی عکاسی شعیب خالق نے اپنے افسانے میں یوں کیا ہے۔

"ظہور آگے بڑھتا ہے اور منہ دانیال کے ہاتھ کی زد پہ رکھتا ہے سانس روکتا اور آنکھیں بند کر لیتا ہے ظہور کے لیے اب تھپڑ محض کسی ایک لمحے میں الجھی دماغ زوں اور سن گالی کی سناتی مشقت بن کر رہ گیا ہے۔"(۱۰)

چائلڈ لیبر کے حوالے سے دیکھا جائے تو بہت ہی کم عمری میں بچوں سے ایسی ایسی مشقت کروائی جاتی ہے کہ بچوں میں سوجھ بوجھ بھی نہیں ہوتی۔اس کی عکاسی شعیب خالق کے افسانے میں بھی نظر آتی ہے۔

"بے چارے ظہور کا دماغ اس لائق نہیں کہ وہ ان کی باتوں سے جان سکے کہ اس کا اصل کام کیا ہے وہ تو جعفر کے جملوں کو لیے یہاں آیا۔"(۱۱)

افسانہ "لاٹو" میں شعیب خالق نے انسانی اعضاء کی سمگلنگ کے ذریعے فرد کے خارجی مسائل کی طرف توجہ مبذول کروائی ہے جس سے معاشرے کے اندر اقتصادی، سماجی اور اخلاقی سطح پر مسائل ابھرتے ہیں "لاٹو" افسانے میں شعیب خالق نے انسانی اعضاء کی سمگلنگ کے ذریعے پیدا ہونے والے مسائل کی عکاسی کی ہے۔

"لاٹو" افسانے کا مرکزی کردار ہے جو سمگلنگ کی زد میں آتا ہے۔ جس کا باپ مر جاتا ہے اور اس کی ماں کسی اور سے شادی کر لیتی ہے۔ اس کی پرورش "دیقے استاد" نے کی ہے۔ "دیقا استاد" اپنے ذاتی مفاد اور اپنے معاشی حالات بہتر بنانے کے لیے ایک ڈاکٹر کی مدد سے مجبور، معصوم بے سہارا اور یتیم بچوں کے جسم کے اعضاء کو فروخت کر دیتا تھا اور اعضاء سے محروم کر کے ان بچوں سے بھیک بھی منگواتا تھا اور جسمانی مشقت کرواتا تھا۔

> " دیقے استاد نے شہر کے ایک بدنام ڈاکٹر سے گٹھ جوڑ کر رکھا تھا اور سرجن سلطان دیقے کے نام نہاد بیٹوں میں چند کے آپریشن کرتا، اعضاء کو بھی فروخت کر دیتا اور بھیک مانگنے پر مجبور کر دیتا۔ "(۱۲)

"بس ایک بسکٹ" میں شعیب خالق نے بچوں کے ساتھ درپیش رویے کی عکاسی کی ہے بچوں کو جب انسانی اعضاء سے محروم کر بھی دیا جائے تو اپنے گھریلو حالات سے مجبور ہو کر بھی بچے اس درد کو برداشت کر لیتے ہیں اس افسانے کا مرکزی کردار "ظہور" کا ہے جو اپنے گھریلو حالات سے مجبور ہو کر کام کرنے لے لیے شہر چلا جاتا ہے۔

افسانہ "لاٹو" شعیب خالق کا ایک ایسا افسانہ ہے جس میں شعیب خالق غریب طبقے کے مسائل پر قلم اٹھاتے ہیں۔ اس افسانے میں غریبوں کی دکھ بھری کہانی ملتی ہے کہ کس طرح سے ان کا استحصال کیا جاتا ہے۔ ساٹھ کی دہائی کے بعد مشینی دور کا آغاز ہو گیا۔ مشینی دور نے معاشرے کے اندر انقلاب برپا کر دیا۔ مشینی دور کی وجہ سے معاشرے کے اندر لوگوں کا رہن سہن کھانے پینے کا انداز، معیار زندگی، روزگار کی صورتحال بہتر ہوئی۔ مشینی دور نے افراد کے بہت سے امور کی انجام دہی میں بنیادی کردار ادا کیا۔ بہت سارے لوگوں کا کام ایک مشین کے ذریعے ہونے لگا۔

جہاں اس سے کارخانوں کے مالکوں کو فائدہ ہوا وہیں معاشرے کے اندر اکثریت طبقے کو نقصان پہنچا۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ مشینوں کا استعمال بے روزگاری کا سبب بنا۔ جس سے معاشرے کے اندر غربت

میں اضافہ ہوا۔ مشینی دور کے بعد بے روزگاری اور مسائل کی کمی کے باعث لوگوں کو روزی روٹی کمانے کے لیے سخت تگ و دو کرنی پڑھ رہی ہے۔ شعیب خالق نے افسانہ "چھتری نما کہانیوں" کا مجموعہ ایک طویل عرصہ بعد شائع کروایا جو کہ ایک صبر آزما کام ہے۔ اس افسانوی مجموعے میں انھوں نے فرد کے مسائل کو آسان اسلوب میں پیش کیا اور ان مسائل کی اس طرح منظر کشی کی ہے کہ قاری کو آسانی سے جدید معاشرے کے فرد سے جڑے مسائل سے آسانی سے آشنائی ہو جاتی ہے۔ اس مقصد کے لیے انھوں جگہ جگہ پنجابی زبان کے الفاظ استعمال کیے ہیں تا کہ قارئین ان کی تحریر کو آسانی سے پڑھ سکیں اور جدید معاشرے میں فرد کو درپیش خارجی مسائل اور مشکلات کو سمجھ سکے۔

ڈاکٹر نجیبہ عارف کہتی ہیں:

> "ایک لکھنے والا کتاب لکھ کر طویل سال انتظار کرتا ہے ---جو کہ ایک صبر والا کام ہے---شعیب خالق نے ڈرامہ نگاری کے فن کو افسانہ نگاری میں خوبصورت طریقے سے استعمال کیا۔ ان کے افسانوں میں جزیات نگاری کے ذریعے منظر کشی کمال کی ہے۔ انھوں نے جگہ جگہ پنجابی زبان کے لفظ مناسب طریقے سے استعمال کیے ہیں اس طرح انھوں نے چست جملوں کا مناسب استعمال کیا ہے "(۱۳)

شعیب خالق جدید دور کے افسانہ نگار ہیں۔ معاشرے کے اندر درپیش مسائل پر نظر رکھتے ہیں۔ اسی کی عکاسی ان کے افسانے "لاٹو" کے اندر ایک اور انداز میں بھی نظر آتی ہے۔ "لاٹو" ایک ایسا شخص تھا جس کے دل میں بہتر وسائل کی خواہش، اپنوں کا دکھ درد اور مستقبل کے ادھورے خواب موجود ہیں۔ بھیک مانگنے کے باوجود بھی دوسروں کی مدد کرنے کے خواہش مند مرکزی کردار کے اندر ابھی بھی بہت سارے ادھورے خواب موجود ہیں۔ "لاٹو" کے کردار کے ذریعے شعیب خالق نے جدید معاشرے کے اندر غریب طبقے کے استحصال اور مسائل کی عکاسی کی ہے کہ معاشرے کا بیشتر حصہ بے روزگار ہونے کی وجہ سے بھیک مانگنے پر مجبور ہے۔

> "لاٹو" پیدائشی طور پر فقیر نہیں تھا۔ اس کا باپ معذور تھا، جو فٹ پاتھوں میلوں ٹھیلوں پر مجمع اکٹھا کر کے اپنے ہاتھ اور زبان کی صفائی کے کرتب دکھایا کرتا تھا۔ "لاٹو "ابھی چار سال کا نہیں ہوا تھا کہ اس کے باپ نے اسے بچے جمورے کے مکالمے رٹا ڈالے تھے۔ پھر کچھ ہی عرصہ بعد "لاٹو" کی چادر تلے چھپی گردن پر چھری بھی پھرنے

لگی۔ ابھی وہ لوگوں کی جیبوں سے سکے نکلوانے کا گر پوری طرح سیکھ نہیں پایا تھا کہ اس کے باپ کی گردن پر قدرت نے چھری پھیر دی اور لاٹو یتیم ہو گیا۔"(۱۴)

شعیب خالق نے افسانہ لاٹو کے ذریعے معاشرے کی تلخ حقیقت کو بیان کیا ہے اور معاشرے کی جیتی جاگتی تصویر ہمارے سامنے لائی ہے جدید معاشرے کے اندر اس طرح کے مسائل سے معاشرے میں عکاسی کی گئی ہے۔

غریب طبقے کے مسائل:

افسانہ "چالیس روپے روزانہ" بھی شعیب خالق کا ایک اہم افسانہ ہے۔ اس میں بھی وہ معاشی مسائل کی وجہ سے غریب طبقے کے مسائل کی جانب قارئین کی توجہ مبذول کرواتے ہیں۔ شعیب خالق کا تعلق جدید معاشرے سے ہے۔ بچوں کو درپیش خارجی مسائل پر ان کی نظر ہے۔ اس کی عکاسی انھوں نے تحریری صورت میں اپنے افسانے "چالیس روپے" میں بھی کی ہے۔ ہمارے جدید معاشرے کے اندر ابھی بھی اکثریت طبقہ غریبوں کا ہے جن کے پاس معاشی وسائل نہیں ہیں۔ غربت سے تنگ آکر والدین دو وقت کی روٹی کے لیے اپنے معصوم بچوں سے مشقت کروانے پر مجبور ہے۔ خارجی مسائل کی طرف توجہ مبذول کروانے میں شعیب خالق کا افسانہ "چالیس روپے" عمدہ افسانہ ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار ایک "لچھے بیچنے والا لڑکا" ہے جس کی عمر سات آٹھ سال ہے۔ گھریلو حالات سے تنگ آکر اس نے لچھے بیچنے شروع کر دیے۔ اس طرح ارد گرد ماحول کو دیکھ کر اس کے دل کے اندر بھی بے شمار خواہشات پیدا ہوئی ہیں۔ وہ پورا پورا دن کھڑے ہو کر لچھے بیچتا۔ مگر چالیس روپے کمانے کی حسرت اس کے دل کے اندر ہی رہی۔ جدید معاشرے کے اندر جیسا کہ دیکھا جاتا ہے کہ تعداد میں زیادہ ہونے کے باوجود بھی ایسے بچوں کی کوئی مدد نہیں کرتا بلکہ ان کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس کی عکاسی اس افسانے کے اندر بھی نظر آتی ہے کہ ایک بچہ جس کی عمر پڑھنے لکھنے اور کھیلنے کی ہے وہ مشقت کرنے پر مجبور ہے۔ شعیب خالق نے اپنے اس افسانے میں اس طرف توجہ مبذول کرائی ہے کہ کس طرح بدتر حالات سے مجبور ہو کر آج بھی بچے پڑھنے لکھنے اور کھیلنے کودنے کی عمر میں مزدوری کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اپنی معصوم خواہشوں کو پورا کرنا ان کا ایک خواب ہی رہ جاتا ہے مگر کوئی ان کی حالت پر ترس نہیں کھاتا اور نہ ان کے مسائل کے حل کی جانب توجہ مبذول کرتا ہے۔

" لچھے والے کی عمر سات آٹھ سال تھی۔ کالی رنگت، چپٹی ناک، میلا کچیلا جوڑا پاؤں میں اپنے سائز سے بڑے پھٹے پرانے شوز۔۔۔۔ لچھے جی لچھے بڑے مزے دار

لچھے کے نعرے لگاتا۔ لڑکوں کا ایک ریلا آتا اور اس سے لچھے لے کر کھاتا شور مچاتا ادھر ادھر بھاگنے لگتا۔"(۱۵)

لاچار اور بے بس بچوں کی حالت زار کی طرف توجہ دینا ناگزیر ہے۔ اس طرح کے غریب بچوں کا بھی حق ہے کہ یہ سکول اور کالج کی تعلیم حاصل کریں اور معاشرے کے مفید شہری بنیں۔ ان کی معصوم خواہشات کا احترام کیا جانا چاہیے۔ فضول خرچی پر پیسے لگانے کی بجائے ایسے بچوں کے مسائل پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ مگر جدید معاشرے میں اس اہم مسئلے کو حل کرنے کے لیے کوئی خاص توجہ نہیں دی جارہی جس سے اس طرح کے لاچار بچے مسائل کا شکار ہو رہے ہیں

شعیب خالق کا افسانہ "بس ایک بسکٹ" بھی ایک ایسا افسانہ ہے جو غریب طبقے کے مسائل کی روداد سناتا ہے۔ اس افسانے میں دیکھا جاسکتا ہے کہ معاشرے کے اندر انسان کی جب بنیادی ضروریات پوری نہیں ہو پاتی تو معاشرے کے اندر غریب طبقوں کے مسائل میں اضافہ ہوتا ہے۔ معاشرے میں بہت سارے مسائل غربت کی وجہ سے پیدا ہو رہے ہیں۔ معاشرے کے اندر جب بیشتر طبقے کی مادی ضروریات پوری نہیں ہو رہی ہوتی تو وہی بیشتر طبقہ اپنے وجود کو بھی فروخت کرنے پر امادہ ہو جاتا ہے۔ غربت کی سب سے بڑی وجہ آبادی میں اضافہ ہے اور دوسری وجہ جنگ ہے۔ دنیا میں انسانوں کو غریب کرنے میں جنگ نے اہم کردار ادا کیا ہے کیونکہ جنگ کے دوران نہ صرف انسانی جانوں کا ضیاہوتا ہے بلکہ مال اور دولت بھی ایک ملک سے دوسرے ملک چلی جاتی ہے۔ اس سے بیشتر طبقہ بنیادی ضروریات سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔ یہی بیشتر طبقہ علم وہنر کی کمی کے باعث آگے ترقی نہیں کر سکتا اور کسی ہنر سے واقف نہ ہونے کی وجہ سے ایک بے کار زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ملک کے اندر بھی ایک اچھا معاشی نظام نہ ہونے کی وجہ سے ہنر سے ناواقفیت ہونے کی بنا پر روزگار نہیں دیا جاتا۔ جس کی وجہ سے سود حاصل کرنے والے لوگ امیر سے امیر تر ہو رہے ہیں لیکن دوسرا طبقہ غریب سے غریب تر ہوتا چلا جارہا ہے۔

غریب طبقہ بھی اپنی زندگی گزارنے پر مجبور ہوتا ہے اور اپنی بنیادی ضروریات پورا کرنے کے لیے گھر کے افراد روزی روٹی کمانے کے لیے گاؤں میں روزگار نہ ہونے کی وجہ سے شہروں کا رخ اختیار کرتے ہیں۔ غریب والدین اپنے کم عمر بچوں کو بھی شہروں میں امیر لوگوں کے ہاں کام کاج کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔ نہ صرف لڑکے بلکہ لڑکیوں سے بھی مشقت کروائی جاتی ہے۔ کم عمر ہونے کے باوجود بھی لڑکیاں اپنی عمر سے زیادہ امور سرانجام دیتی ہے۔

شعیب خالق ایک جدید افسانہ نگار ہیں۔ غریب طبقے کے مسائل پر ان کی گہری نظر ہے غریب طبقے کے مسائل کو اپنے افسانے "بس ایک بسکٹ" میں اس انداز سے پیش کرتے ہیں کہ لڑکوں کے ساتھ ساتھ غریب طبقے کی لڑکیاں بھی روزی روٹی کمانے کے لیے شہروں میں مشقت کرتی ہیں۔ اس کی عکاسی ان کے افسانے "بس ایک بسکٹ" میں نظر آتی ہے کہ کس طرح سے غریب طبقے میں لڑکوں کے ساتھ ساتھ لڑکیوں سے بھی کام کروا کر ان کا استحصال کیا جاتا ہے۔

> "جعفر کوئی احسان نہیں کرتا، مطلب کہ وہ غفورے کی جوان بیٹی جو اس کے شہر میں کوٹھی میں نوکرانی ہے۔ یہاں باپ ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے گندی رضائی کی گٹھڑی کو درد بھری نگاہوں سے دیکھتا ہے تو اس کی آواز سرگوشی میں اتر جاتی ہے اتنا پیسہ تو کوئی باہر ملک سے نہیں بھیجتی جو پچھلوں کو وہ بھیجتی ہے۔۔۔۔ توبہ توبہ۔۔۔ اللہ معافی۔"(۱۶)

غریب والد اپنی بیماری اور بے بسی کے باعث اپنی جوان بیٹی کو "جعفر" کے ساتھ شہر بھیج دیتا ہے۔ وہ اپنے ماں باپ کے مالی حالات کو بہتر کرنے کے لیے شہر میں کام کرنے پر مجبور ہے۔ حالانکہ اس کی عمر کھلونوں سے کھیلنے کی تھی لیکن اس کے باوجود وہ پوری مشقت سے کام کر کے پیسے گھر بھیجوا دیتی تھی تاکہ اس کے گھر کا چولہا جلتا رہے۔ لیکن اس قربانی کے باجود بھی اس کے گھر کے مسائل جوں کے توں ہیں۔ جدید معاشرے کے اندر فرد چاہے وہ لڑکے ہوں یا لڑکیاں اس طرح کے خارجی مسائل سے دوچار ہیں۔

شعیب خالق اپنے افسانے "اپنا گھر" میں جدید معاشرے کے فرد کے ایک اور اہم مسئلے کو موضوع بحث بناتے ہیں کہ ذاتی رہائش کا نہ ہونا بھی جدید معاشرے کے افراد کا سب سے گھمبیر مسئلہ بن چکا ہے۔ سرمایہ داروں کا سرمایہ داری حکمت عملی اور حکمرانوں کی غفلت نے اس مسئلے کو اس سطح پر پہنچا دیا ہے کہ آج کا انیس بیس گریڈ کا آفیسر بھی اپنا ذاتی گھر شہروں کے اندر نہیں بنا سکتا اور عموماً جو لوگ کرائے کے مکان میں رہتے ہیں وہ آدھی تنخواہ مالک مکان کو دینے پر مجبور ہیں۔ بڑے شہروں کے اندر کرایہ بیس ہزار سے کم کوئی بھی وصول نہیں کرتا۔ تنخواہ دار طبقے کے علاوہ معاشرے کے اندر ایک ایسا طبقہ بھی ہے جو مزدوری کر کے ایک دن کے پیسے لیتا ہے۔ ایسا طبقے کے لیے کرائے کا مکان لینا ایک نہایت مشکل کام ہے۔ شہر کے اندر ایک کرائے کا مکان لینے کی بھی سکت نہیں رکھتے۔ یہ طبقہ دیہاتوں کے اندر بھی اپنی ذاتی رہائش کے حوالے سے مسائل کا شکار ہے۔ اس کی عکاسی شعیب خالق نے اپنے افسانے "اپنا گھر" میں کی کہ جدید معاشرے کے اندر افراد خارجی

مسائل میں سے اس طرح کے مسئلے سے بھی دوچار دکھائی دیتے ہیں۔ اس افسانہ میں واحد متکلم کا مرکزی کردار بھی اپنے ذاتی گھر کی خواہش رکھتا ہے۔ وہ جب دوسروں کو اپنے ذاتی گھر میں رہتے دیکھتا ہے۔ تو وہ سوچتا ہے کہ یہ لوگ کتنے خوش قسمت ہیں کہ ان کا اپنا گھر ہے، اپنی رہائش ہے۔ ان کا اپنا گھر ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ وہ دوسروں کے گھروں کو بے بسی اور مایوسی سے دیکھتا ہے۔

> "اپنا گھر بھی کتنی بڑی نعمت ہے۔ جو غریب لوگ کرائے کے گھروں میں رہتے ہیں ان کے لیے تو تیس دن، تیس گھنٹوں کی صورت گزر جاتے ہیں۔ لوگ شاہد جس مکان میں رہتے ہیں اسے اس لیے اپنا گھر کہتے ہیں کہ انہیں اس مکان کا کرایہ ادا نہیں کرنا ہوتا۔ اس کے منہ پر ہمدرد، مسکراہٹ کا تاثر فوراً سنجیدگی میں پلٹ گیا۔"(۱۷)

شعیب خالق نے جدید معاشرے کے اندر رہائش سے درپیش مسائل پر قلم اٹھایا ہے کہ آج کے دور میں بھی رہائش کا مسئلہ دن بدن گھمبیر ہوتا جارہا ہے۔ وہ لوگ جن کو مکان کا کرایہ ادا کرنا ہوتا ہے ان کے تیس دن بھی تیس گھنٹوں کی طرح گزر جاتے ہیں ۔ دیگر بنیادی ضروریات پوری کرنے کے ساتھ ساتھ ہر مہینے کرائے جیسے مسائل سے بھی دوچار ہوتے ہیں۔ جس کی وجہ سے مسائل کا بوجھ مزید بڑھ جاتا ہے۔

جدید معاشرے کے اندر بھی غربت ایک اہم مسئلہ ہے۔ امیر ہو یا غریب ہر فرد کے اندر بہتر سے بہتر ہونے کی خواہش موجود ہوتی ہے۔ لیکن غریب طبقہ وسائل کی کمی کے باعث اپنی خواہشوں کو پورا نہیں کر سکتا۔ شعیب خالق نے بھی ایسے طبقے کی عکاسی کی ہے کہ جس کے اندر بہتر ہونے کی خواہش تو موجود ہے لیکن وسائل کی کمی کے باعث اینٹ اور پتھر کی طرح ایک ہی جگہ زندگی گزرانے پر مجبور ہے بڑی گاڑیاں، اونچے بنگلے اور بہتر طرز زندگی کی خواہش کے ساتھ ساتھ عیش و عشرت کی زندگی گزارنا ہر انسان کا خواب ہے۔ ہر کوئی یہی چاہتا ہے کہ اس کو زندگی کے اندر مسائل درپیش نہ ہوں۔ لیکن وسائل کی کمی کے باعث معاشرے کے اندر ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو خارجی مسائل سے دوچار ہے۔ لیکن پوری زندگی سفر کرتا ہوا اور بہتر زندگی کی خواہش دل میں لیے ہوئے دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔

> "سب کچھ ۔۔۔۔ اور سب سے مل کر کچھ بھی نہیں، میں چاہتا ہوں، لمبی گاڑی، اونچا بنگلہ، یہ تمہارے جرثومہ ذدہ جسم کے ہدف ہیں، مگر کائنات میں تمہارے سفر کا ان سے کوئی تعلق نہیں تم اگر انسان نہ بھی ہوتے تو کوئی بات نہ تھی۔ سفر تو تھا ہی تمہارے ہونے سے بس "ہونا" ہوتا ہے۔ باقی اینٹ پتھر بھی زندگی ہی ہے اپنی اپنی جگہ۔"(۱۸)

چھوٹے پیشوں سے حقارت:

پیشہ کوئی بھی برا نہیں ہوتا خواہ وہ گلی میں جھاڑو لگانے والا ہو یا بیس گریڈ کا آفیسر ہی کیوں نہ ہو۔ حلال طریقے سے روزی کمانے کا طریقہ اللہ تعالی کو بھی پسند ہے۔ پیشہ کوئی بھی ہو اگر فرد اس سے مطمئن ہو کر جائز طریقے سے رزق کماتا ہے تو اس میں بہت سکون ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی معاشرے کے اندر مختلف پیشوں کے حوالے سے ہماری سوچ بن گئی ہے کہ بہت سے پیشوں کو ہم اپنی سوچ کے مطابق برا سمجھتے ہیں۔ بعض اوقات مالی وسائل نہ ہونے کی وجہ سے لوگ ترکھان کا پیشہ اختیار کر لیتے ہیں لیکن سماج کے اندر لوگ اس پیشے کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں حالانکہ ترکھان بھی ایک ہنر کا کام ہے۔ لیکن ہر طبقے نے مختلف پیشوں کے حوالے سے اپنی سوچ بنا رکھی ہے اور بہت سے پیشوں کے حوالے سے منفی سوچ رکھتے ہیں۔ مختلف پیشوں سے وابستہ افراد حالات کی وجہ سے ترکھان، لچھے بیچنے کا کام، نائی، موچی، لوہار کا پیشہ اختیار کر لیتے ہیں۔ ہر کوئی اپنی بہتری سوچتے ہوئے کسی نہ کسی شعبے سے وابستہ ہو جاتا ہے۔ اپنا اور اپنے گھر والوں کا پیٹ پالنے کے لیے مختلف شعبے اختیار کیے جاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ترقی کے دروازے کھلتے جاتے ہیں۔

یہ بات بھی سچ ہے کہ اگر یہ پیشے مختلف افراد اختیار نہ کریں تو معاشرے کا شیرازہ بکھر جائے گا اور لوگ کسی بھی پیشے کو حقارت کی نگاہ سے نہ دیکھیں تو معاشرہ ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکتا ہے۔ لیکن اس جدید دور کے اندر افسروں کے علاوہ دیگر چھوٹے پیشوں سے وابستہ لوگوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ان کو سماج کے اندر عزت بھی نہیں دی جاتی جس کے وہ مستحق ہوتے ہیں۔ شعیب خالق نے بھی اپنے افسانے "چالیس روپے" کے اندر مختلف پیشوں سے حقارت پر روشنی ڈالی ہے۔ اگر کوئی روزی روٹی کمانے کی خاطر کوئی پیشہ اختیار کر لیتا ہے تو سماج کے اندر امیر طبقہ اپنے سے کم لوگوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اگر کسی کے پاس بنیادی وسائل موجود ہیں تو وہ اپنے سے کم وسائل والے افراد سے تعلق بھی قائم نہیں کرتا۔ اس کی عکاسی شعیب خالق نے اپنے افسانے "چالیس روپے" میں یوں کی ہے۔

> "دو لڑکے جن کی عمر لچھے والے جتنی ہی ہو گی دیوار پر چڑھے اور گیند کو ڈھونڈتے ان کی نگاہیں لچھے والے پر آ ٹھہریں انھوں نے جھکتے ہوئے پوچھا اوے لچھے والے کیا ہوا ہے؟ لچھے والے نے ساکت آنکھوں کو آہستگی سے گھما کر دیکھا"(۱۹)

معاشرے کے اندر کسی بھی پیشے کو حقیر سمجھنے کا تصور بہت نمایاں ہو چکا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ ہمارے دل اور ذہن میں تصور اتنا پختہ ہو گیا ہے کہ امیروں اور غریبوں کے پیشے الگ الگ ہوتے ہیں۔ امیر

اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوتے ہیں۔ غریب نچلے طبقوں سے وابستہ ہوتے ہیں۔ اس اقتباس کے اندر بھی دو لڑکے جن کا تعلق امیر خاندان سے ہے حالانکہ وہ اس لڑکے کے ہم عمر ہیں لیکن اس کی حالت اور پیشے کو دیکھ کر وہ لڑکے اس کو "اوئے لچھے والے" کہ کر پکارتے ہیں اور اس کو معمولی اور کم تصور کرتے ہیں۔

جدید معاشرے نے جہاں لوگوں کا رہن سہن بدلا وہیں کھانے پینے کے انداز اور رسم ورواج میں بھی نمایاں تبدیلیاں پیدا ہو گئیں لیکن تعلیمی شعور ہونے کے باوجود بھی اور وسائل ہونے کے باوجود بھی منفی سوچ کا خاتمہ نہیں ہو سکا جدید معاشرے کے اندر بھی لوگ اپنے سے کم تر لوگوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

شعیب خالق نے اپنے افسانے "ایک نوکر کی کہانی" کے اندر بھی امیر طبقے کی منفی سوچ کی عکاسی کی ہے۔ امیر طبقے کے افراد اپنے سے کم تر لوگوں کو ایک شئے کی حیثیت سے سمجھتے ہیں۔ وہ جانوروں اور غریب لوگوں میں فرق محسوس نہیں کر سکتے۔ اس کی عکاسی اس افسانے کے اندر بھی نظر آتی ہے کہ افسانے کا مرکزی واحد متکلم کا کردار جس کے پاس تمام وسائل موجود ہیں۔ جب ایک بچہ نوکر کی حیثیت سے کام کرنے آتا ہے تو وہ اس کے ساتھ جانوروں کی طرح سلوک کرتا ہے۔ گھر کے تمام کام کروانے کے باوجود بدلے میں صرف ایک ہزار روپے تنخواہ اور لیٹنے کے لیے ڈرائینگ روم کے اندر نیچے جگہ دی جاتی ہے۔

> "دو وقت کا کھانا اور ناشتہ ملے گا گھر کی جھاڑ پونچ صفائی، نزدیکی مارکیٹ سے ضرورت کا سودا سلف لانا بچوں کے ساتھ شام پارک میں جانا اور ان کو واپس لے کر آنا، روٹیاں پکانا تنخواہ کے معاملے میں آخری بات صرف ایک ہزار روپے۔۔۔"(۲۰)

احساس کے حوالے سے دیکھا جائے چونکہ بچہ ایک غریب طبقے سے وابستہ ہے اس ہی وجہ سے گھر کے تمام کام کاج کروانے کے باوجود بھی اس کے ساتھ جانوروں جیسا سلوک روا رکھا جاتا ہے۔

تعلیم سے دوری:

جدید معاشرے کے اندر فرد کو جہاں بہت سی سہولیات میسر ہوتی ہیں وہیں ابھی بھی بہت سے مسائل ہیں جن میں ایک اہم مسئلہ جدید معاشرے کے اندر بچوں کی تعلیم سے محرومی ہے۔ وہ بچے جن کی عمر ابھی پڑھنے لکھنے سکول، کتابیں اور اپنے ہم ساتھیوں کے ساتھ کھیلنے کودنے کی ہے لیکن وسائل کی کمی کے باعث اپنی کم عمری میں ہی دوسروں کے حساب سے جینا شروع کر دیتے ہیں۔ ایسے بچوں کے اندر احساسات، سماجی آزادی، ذہنی اور جسمانی شعور اور خواہشات کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ تعلیم سے دوری کے باعث بعض اوقات یہی بچے مختلف قسم کے جرائم میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی تعلیم کی اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں

کیا جا سکتا۔ شہروں اور دیہاتوں میں بھی سرکاری سکول کھول دیئے گئے ہیں جن میں مفت تعلیم کے ساتھ مفت درسی کتب دی جاتی ہیں تاکہ بچے تعلیم حاصل کر کے اپنا بہتر مستقبل سنوار سکیں۔ مگر اس کے باوجود بھی جو بچے غربت کا شکار ہیں ان بچوں کا تعلیم حاصل کرنا ایک ادھورا خواب ہی ہوتا ہے۔ کیونکہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھی بے شمار مسائل سامنے آتے ہیں۔ تعلیم حاصل کرنے کے لیے فیس اور کتابوں کے علاوہ بھی اور بہت ساری بنیادی ضروریات ہوتی ہیں۔ جن میں سکول یونیفارم، سکول بیگ، پین، پنسل اور دیگر بہت سارے اخراجات ہوتے ہیں جو غریب بچوں کی پہنچ سے بہت دور ہوتے ہیں۔ ان ہی محرومیوں کی وجہ سے غریب بچے دو وقت کی روٹی بھی بمشکل کھاتے ہیں۔ گھر کا چولہا جلانے اور دیگر ضروریات پوری کرنے کے لیے ان بچوں کو کم عمری ہی میں محنت ضروری کرنا پڑتی ہے۔

شعیب خالق نے اپنے افسانے "ایک روپیہ روزانہ" میں بھی ایک ایسے بچے کی عکاسی کی ہے جو غریب خاندان سے تعلق رکھتا ہے لیکن اس کے دل کے اندر تعلیم سے محبت بھی ہے۔ وہ تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہے لیکن گھریلو حالات سے مجبور وہ تعلیم حاصل نہیں کر سکتے۔ افسانے کا مرکزی کردار "چھوٹو" اپنی خواہش کو دبا کر محنت مزدوری کرتا ہے تاکہ اس کے گھر کا چولہا جلتا رہے۔ تعلیم سے دوری کے باعث وہ بچہ گلی محلوں میں کوڑا کرکٹ اٹھانے پر مجبور ہوتا ہے۔

> "نہیں جی ہم چور نہیں ہم بچے ہیں۔ چھوٹو کی معصومیت میں کھوٹ نہیں تھا۔ او کیا، بچے چور نہیں ہوتے" حوالدار نے ہنستے ہوئے جملہ کسا تو انسپکٹر کے چہرے پر بھی مسکراہٹ پھوٹ پڑی۔ اور جو پیسے کماتے ہو ان کا کیا کرتے ہو۔ گھر والوں کو دیتے ہو، نہیں، انسپکٹر اور سپائیوں کے چہرے پر اب ان چاروں کے لیے غصے کی جگہ مسکان تھی۔ وہ جی مجھے پڑنے کا شوق ہے۔ میں سکول کی داخلہ فیس اور کتابوں کے لیے پیسے جمع کر رہا ہوں اس لیے یہ کام کرتا ہوں۔"[۲۱]

جدید دور کے اندر بھی تعلیم سے دوری ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ تعلیم حاصل کرنا ہر فرد کا بنیادی حق ہے۔ چاہے وہ امیر ہو یا غریب ہو۔ افسانے کا مرکزی کردار "چھوٹو" وسائل کی کمی کے باعث کچرا اٹھانے پر مجبور ہے لیکن اس کے دل کے اندر تعلیم حاصل کرنے کی خواہش موجود ہے۔ وہ اپنی تعلیم کے حصول کے لیے محنت مشقت کرتا ہے لیکن سماج کے اندر ایسے بچوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ان بچوں کے احساسات، جذبات اور خواہشوں کو ملحوظ خاطر نہیں رکھا جاتا۔

ملک کے افراد کا ترقی نہ کرنا اور ملکی ترقی کی رکاوٹ کی سب سے بڑی وجہ ناخواندگی کی بڑھتی ہوئی تعداد ہے۔ جدید دور کے باوجود بھی یہ مسئلہ روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ موجودہ دور میں حالات کو دیکھا جائے تو بہت زیادہ بچوں کی تعداد ایسی ہے جو تعلیم سے محروم ہے اور محنت مشقت کرنے پر مجبور ہے۔ اس کی اہم وجہ غربت ہے۔ جس میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ یہی غربت بچوں کو تعلیم سے محروم کر رہی ہے۔

شعیب خالق نے اپنے افسانے "چالیس روپے" کے اندر بھی غربت سے مجبور ہو کر تعلیم سے دور بچوں کی عکاسی کی ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار "چھوٹو" جس کی عمر سات آٹھ سال ہے لیکن وہ بچہ اپنے بچپن کو بھی بھول کر محنت مزدوری کرنے پر مجبور ہے جس کی بنیادی وجہ غربت ہے۔ غربت ہی افسانے کے مرکزی کردار کو تعلیم کی طرف گامزن نہیں کر رہی افسانہ کا مرکزی کردار لچھے بیچ کر اپنی روزی روٹی کمانے پر مجبور ہے۔ اس بچے کے اندر بھی بنیادی ضروریات حاصل کرنے خواہش موجود ہے لیکن وسائل کی کمی کے باعث وہ چیزوں کو دور سے ہی دیکھتا ہے۔ غربت اور مالی حالات سے مجبور ہور کر وہ لچھے بیچنے سکول کے باہر تک پہنچ گیا۔ اسے سکول کی تفریح کا ٹائم بھی معلوم ہوتا لیکن حالات کی وجہ سے وہ سکول کے اندر نہیں جا سکتا تھا۔ تعلیم سے دوری کے باعث وہ باہر ہی اپنے لچھے بچوں کو بیچتا ہے اور ان کو حسرت کی نگاہ سے بھی دیکھتا۔ ان کے بیگ، یونیفارمز اور جوتوں کو بھی حسرت سے دیکھتا ہے۔ لیکن غربت کے باعث ان تمام چیزوں تک رسائی اس کے لیے ممکن نہیں تھی۔

> "وہ ہر روز سکول کے گیٹ پر ہاف بریک کی گھنٹی بجتے ہی اپنے ہاتھوں میں پکڑی ننھی سے گھنٹی زور زور سے ہلاتا اور شور مچانے لگتا۔ لچھے جی لچھے، بڑے مزے دار لچھے۔۔۔ پھر شروع میں لڑکوں کا ایک ریلا آتا اور اس سے لچھے لے کر کھاتا، شور مچاتا ادھر اُدھر بھاگنے لگتا۔ لیکن بعد میں وہ آہستہ آہستہ گھنٹی بجاتا سید ھا مارکیٹ میں جوتوں کی دوکان کے سامنے آبیٹھتا اور پھر وہاں بیٹھے بیٹھے بچے کچھے لچھے بھی بیچتا اور ربڑ کے اس جوتے کو بھی دیکھتا رہتا جو چمکتے چمڑے سے بنایا گیا معلوم ہوتا ہے وہ جوتا، یوں اچانک نجانے کیوں اس کے دماغ میں تسمے گس کر بیٹھ گیا تھا۔"(۲۲)

تعلیم حاصل کرنا معاشرے کے اندر لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے ضروری ہے۔ تعلیم کے بغیر کوئی معاشرہ ترقی نہیں کر سکتا۔ بچوں کے احساسات و جذبات ہوتے ہیں۔ تعلیمی ماحول کے اندر بچے ایک دوسرے سے بہت کچھ سیکھتے ہیں۔ جدید معاشرے کے اندر تعلیم کی حیثیت اور اہمیت بہت بڑھ گئی ہے لیکن اس کے

باوجود بھی لڑکوں اور لڑکیوں کی بہت بڑی تعداد اب بھی تعلیم حاصل نہیں کر رہی۔ اس سے حالات بہتر ہونے کی بجائے مزید خراب ہو رہے ہیں۔ خاص کر اعلی تعلیم کے لیے جب یونیورسٹیوں کا رخ کیا جاتا ہے تو یونیورسٹیوں کی فیس اور دیگر اخراجات اس قدر زیادہ ہوتے ہیں کہ اکثر طلبا تعلیم حاصل نہیں کر سکتے۔

شعیب خالق جدید دور کے ایسے افسانہ نگار ہیں۔ جو حالات کو باریک بینی سے دیکھتے ہیں اور اس اہم مسئلے کی طرف توجہ مبذول کروانے کی کوشش کرتے ہیں۔

> "اور کچھ نہیں تو سرکاری سکول کالج تک، کم از کم، بچوں کی تعلیم بہت زیادہ خرچ نہیں مانگتی لیکن جب بچے یونیورسٹی میں چلے جائیں تو غریب ماں باپ کے لیے ان کے سمسٹر کی بھاری فیس کینسر کی صورت اختیار کر جاتی ہے۔ لوگ بھی لوڈ شیڈنگ، مہنگائی اور حکمرانوں کی کرپشن کے عذاب سے چھٹکارا چاہتے ہیں۔ مفت تعلیم اور صحت کے کاغذی وعدے اور۔۔۔۔۔"(۲۳)

اس بات کی عکاسی واضح طور پر موجود ہے کہ غریب والدین کے لیے اپنا پیٹ کاٹ کر اپنے بچوں کے لیے اعلی تعلیم کا حصول بہت مشکل ہوتا ہے۔ تعلیمی لگن کے حوالے سے دیکھا جائے تو ان بچوں میں بہت قابلیت ہوتی ہے لیکن وسائل کی کمی کے باعث اعلی تعلیم تک رسائی مشکل ہوتی ہے کیونکہ اعلی تعلیم دینے والی یونیورسٹیوں کی فیس بہت زیادہ ہوتی ہے۔ فیسوں کے علاوہ یونیورسٹیوں کے دیگر اخراجات اور معاملات بھی متوسط طبقے کے والدین کے لیے ناقابل برداشت ہوتے ہیں۔ شعیب خالق نے اپنے افسانے "اپنا گھر" کے اندر رائج تعلیم نظام، مسائل اور امور کا جائزہ لیا ہے اور تعلیم کے حوالے سے درپیش مسائل پر قارئین کی توجہ مبذول کروانے کی کوشش کی ہے جو بظاہر معمولی نظر آتے ہیں لیکن ان کے اثرات دیرپا ہیں۔

جنسی بے راہ روی:

معاشرتی مسائل پر شعیب خالق کی گہری نظر ہے انہوں نے اپنے افسانے "مندرجہ ذیل" میں اس کی عکاسی کی ہے۔ جدید معاشرے کے اندر لڑکے اور لڑکیاں جہاں تعلیمی اداروں میں اور دیگر اداروں میں اکٹھا اٹھنا بیٹھنا اور کھانا پینا کرتے ہیں وہاں آج کے دور کے اندر لڑکوں اور لڑکیوں کی دوستی کو بھی معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ انہیں ایک دوسرے سے جنسی تعلقات کی بھی بہت آزادی مل گئی ہے۔ ٹیکنالوجی نے جنسی بے راہ روی کو فروغ دیا ہے۔ "مندرجہ ذیل" افسانے کے اندر بھی ایسے بے شمار کردار بھی پیش کیے ہیں جو جنسی بے راہ روی کا شکار ہیں۔ لیکن اس دور کے اندر لڑکے اور لڑکیوں کے جنسی تعلق کے علاوہ لڑکوں اور لڑکیوں کے

درمیان بھی یہ تعلق موجود ہوتے ہیں۔ لڑکیوں کے علاوہ لڑکوں کو بھی جنسی تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ شعیب خالق نے اس طرح کے مسائل کو اپنے افسانے "مندرجہ ذیل" کے ذریعے سامنے لایا ہے۔ اس حوالے سے مرکزی کردار ایک بچہ "یوسف" ہے جس کو سماج کے جنسی ہوس کا شکار افراد "ملکی"، "فیاضا" اور دیگر تانگے والے جنسیت کا شکار بنانا چاہتے ہیں۔

"ملکی نے اس کے گھٹنوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا "اوے یار سمندرے، سکول سے یوسفی کو واپسی پر یہ ذرا احاطے کا چکر لگوا، کہ ایسے ہی ہمارے سامنے میرا مطبل کہ ذرا سا گزار جایا کر ادھر بس اور کیا۔ بالکل باقی ایمان سے سولہ آنے حرامی کی نسل ہو جو تیرے سوا "یوسفی" کو ہاتھ بھی لگائے ہاتھ ہی نہ کاٹ دوں میں۔"[۲۴]

جدید معاشرہ کے اندر لڑکے بھی لڑکوں کے ساتھ جنسی تشدد کرتے ہیں۔ شعیب خالق اس اہم مسئلے کی بھی تصویر کشی کی ہے۔ "ملکی"، "حنیفے" اور "فیاضے" کی پرورش ایک ایسے ماحول میں ہو رہی ہے جہاں انہیں ماں باپ کی توجہ حاصل نہیں ہوتی ہے۔ ان کی ایک ایسے ماحول میں نشو نما ہوتی ہے جہاں ایک صحت مند ذہن کی تربیت نہیں ہو سکی۔ ان کے ارد گرد ماحول نے انکی شخصیت پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ شعیب خالق نے اس ساری صورتحال کی بدولت جنسی جذبات کی عکاسی کرتے ہوئے معاشرے کے بظاہر معزز نظر آنے والے افراد کے اصل چہرے بے نقاب کر کے ان کے شخصی رویوں کو غیر جانبداری سے سامنے لایا ہے۔

یہاں محض معاشرے کے کسی ایک فرد کے عمل کو زیر بحث نہیں لایا گیا۔ بلکہ معاشرے کی ان تمام خرابیوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے جو اس تمام صورت حال کی ذمہ دار ہے۔ جس میں تانگے کے کوچوان جیسے کردار پروان چڑھتے ہیں۔ خاص کر تانگے کے کوچوانوں کا ذکر کر کے ان کے فرائض کی طرف سے کوتاہیوں کو بھی منظر عام پر لایا گیا ہے۔ ایسے ماحول میں فرض شناس لوگ بھی غیر اخلاقی افعال اور سرگرمیوں میں مرتکب ٹھہرتے ہوئے اپنے فرائض سے کوتاہی برتتے ہیں۔ اسی طرح شعیب خالق نے لڑکوں کی اس طرح کی جنسی سرگرمیوں کا ذکر کر کے اس قسم کی برائی کی حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں معاشرتی رویوں اور بے جا اقدار کی بھی عکاسی کی ہے۔

افسانہ "مندرجہ ذیل" میں لڑکوں کی ہم جنسیت کو شعیب خالق نے واضح "فیاضا"، "ملکی" اور "حنیفے کے کردار کے ذریعے پیش کیے ہیں جو ہم جنسیت جیسی غیر اخلاقی بیماری میں مبتلا ہیں اور اپنے اقدار سے انحراف کی راہ پر چل پڑے۔ سماجی تناظر میں "فیاضے"، "ملکی"، اور "حنیفے" کے کردار کا جائزہ لیا جائے تو ان

تینوں کرداروں نے سماج اور مذہب دونوں سے بغاوت کا راستہ اختیار کیا ہے کیونکہ ان کرداروں کا جو رویہ ہے سماج اس کی ہرگز اجازت نہیں دیتا۔ لیکن ان کرداروں کو سماج اور اس کے اصولوں کی کوئی پراہ نہیں وہ اپنے جسم کی آرزو کو پورا کرنے میں مگن ہیں۔ شعیب خالق نے جنسی حوالے سے جس طرح اپنے مردانہ کرداروں کا تجزیہ پیش کیا ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ اس سے بظاہر معزز نظر آنے والے بعض افراد کے اصلی چہرہ سامنے آتے ہیں اور ان کے مردانہ کردار روایت سے انحراف کرتے ہوئے بغاوت کا راستہ اپناتے ہیں۔ پروفیسر عبد السلام لکھتے ہیں:

> "ماں باپ کی تربیت اور محبت اسے حاصل نہیں ہو پاتی۔ لہذا جذبہ محبت کی عدم تسکین جہاں اس میں احساس کمتری پیدا ہوتی ہے۔ وہاں اسے Seif Centered بھی بناتی ہے۔ انا کا گداز جسم اس میں نفسیاتی لذت کا احساس پیدا کرتا ہے۔ انا اور اس کے عاشق کی حرکت اس کے تحت الشعور میں جنسی جذبہ پیدا کرتی ہے۔" [۲۵]

جنسیت کے حوالے سے ان کے ناولٹ "آنٹی" کے اندر بھی اس کی بہترین عکاسی ملتی ہے۔ معاشرتی مسائل پر شعیب خالق کی گہری نظر ہے۔ ناولٹ کا ایک اہم موضوع جنسی بے راہ روی ہے۔ ناولٹ میں "آنٹی عابدہ" کا کردار ایک ایسا کردار ہے جو جنسی بے راہ روی کا شکار ہے۔ ماں باپ کی عدم توجہ کی وجہ سے اس کے ذہن پر منفی اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ اس کے بعد جب "عابدہ" اور "راجو" کے آپس میں تعلقات قائم ہوئے تو اس عاشق کے تعلقات نے "عابدہ" پر منفی تاثر چھوڑا ہے۔ تنویر انجم لکھتے ہیں:

> "عورت اپنی جنسی خواہش کی اسیر ہے۔ وہ کسی بھی سماجی گروہ سے تعلق رکھتی ہو وہ اپنی جنسی خواہش کی تکمیل کے لیے رشتوں کو بالائے طاق رکھ کر معاشرے کی مروجہ اخلاق کو توڑ سکتی ہے۔۔۔ جسمانی لذت کے جوار بھاٹے کے آگے کوئی سماجی رشتہ یا مرتبہ اس کے لیے اہمیت نہیں رکھتا۔" [۲۶]

"عابدہ" کے کردار کے حوالے دیکھا جائے تو "عابدہ" کی پرورش ایک ایسے ماحول میں ہو رہی ہے جہاں اسے ماں باپ کی توجہ حاصل نہیں ہے اور جس کے زیر نگرانی اس کی پرورش ہوئی ہے وہ بھی اس کی صحت مند ذہن کی تربیت نہ کرسکے۔ محلے والی عورتوں کی بلا وجہ تنقید اور کوسنوں نے اس کے اندر باغیانہ سوچ کو اور ابھارا۔ ان تمام تر مسائل کا سامنا کرنے کے باوجود بھی اس نے "راجو" کے ساتھ گہرے تعلقات وابستہ کر لیے۔ شعیب خالق نے بڑی عمر کی عورتوں میں ہم جنسیت جیسے معاملات کو خاص طور پر موضوع بنایا ہے۔

جس سے ایک طرف تو بڑی عمر کی لڑکیوں کے جنسی جیسے جذبات کی عکاسی کی ہے تو دوسری طرف بے جا معاشرتی دباؤ اور گھٹن کو وجہ قرار دیا ہے۔ شعیب خالق نے جنسی مسائل کی عکاسی کرتے ہوئے معاشرے کی بڑی عمر کی عورتیں جو بظاہر شریف نظر آتی ہیں ان کے اصل چہرے بے نقاب کرتے ہوئے ان کے رویوں کو غیر جانبداری سے بیان کیا ہے۔ اس حوالے سے شعیب خالق رقمطراز ہیں:

"تم سے پیارا اچھا اور میری جان کوئی بھی نہیں" وہ میری پشت سے کمر کے گرد باہوں کا دائرہ کم کرتے ہوئے بولی اس دوران میں اسے پچھلے گیٹ سے نکالنے کا بہانہ سوچ رہا تھا کئی بار اس خواہش نے بھی ستایا کہ دروازہ کھول کر اسے پھر اندر لے جاؤں۔ لیکن برآمدے سے باہر قدم رکھتے ہی اس پر گھبراہٹ طاری ہو گئی اور اس نے پردہ فوراً چہرے پر گرا لیا"۔ "(۲۷)

"عابدہ" کے حوالے سے دیکھا جائے تو وہ عدم توجہی کا شکار تھی حالانکہ اس کی شادی "بٹ صاحب" سے ہوئی گئی تھی لیکن اس کے باوجود بھی جنسی محرومی سے شکار ہونے کے باعث اپنی جنسیت کی تسکین کے لیے اس نے "راجو" کے ساتھ اپنے تعلقات وابستہ کر لیے اور جنسیت کی تسکین کے لیے "راجو" نے بھی اپنے سے بڑی عمر کی عورت میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔

ممتاز مفتی لکھتے ہیں:

"آج کل ساری لڑکیاں ہی سٹیٹس میکرز ہیں۔ پہلے لڑکے کو تولتی ہیں بنگلہ ہے۔ ؟کار ہے؟ انٹر کان لے جائے گا۔ پھر بات کرتی ہیں۔ رومان کا دور گیا۔ اب نہیں چلتے رومان اب افیئر چلتے ہیں۔ بڑی کیلکولیٹنگ ہو گئی ہیں لڑکیاں"۔ "(۲۸)

ناولٹ "آنٹی" کی مرکزی کردار "عابدہ معاشرتی پابندیوں کی پرواہ کیے بغیر اپنی من مانی کرتی ہے۔ اس کردار سے سماج سے بغاوت کا راستہ اختیار کیا گیا ہے۔ کیونکہ سماجی حوالے سے دیکھا جائے تو سماج بڑی عمر کی عورتوں اور شادی شدہ عورتوں کو دوسرے مردوں کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ لیکن "عابدہ" کو سماج کی پرواہ نہیں ہے۔ سماج کی پرواہ کیے بغیر اشاروں اشاروں میں وہ اپنی محبت کا اظہار "راجو" سے کر دیتی ہے۔

تنویر انجم رقمطراز ہیں۔

"جنسی شناخت ہر عورت کے لیے اس کے انسانی شناخت کا جزو ہے۔۔۔۔ معاشرہ کبھی

غیر جنسی نہیں ہوتا۔ اور جہاں کہیں اس منافقت کو روا رکھا جاتا ہے۔ اور اس طرح عورت کی جنسی ضرورت اور جنسی شناخت کو مسلخ کیا جاتا ہے۔ وہاں عورت اپنی پوشیدہ قوت سے اپنی سیکشر والٹی کے اثبات کے لیے رہیں ڈھونڈ نکالتی ہیں۔"(۲۹)

شعیب خالق کی معاشرتی مسائل پر گہری نظر ہے کیونکہ آج کے دور کے اندر اس قسم کے تعلقات کو معیوب سمجھا جاتا ہے اور سماج بھی اس کی اجازت نہیں دیتا۔ لیکن جدید معاشرے کے اندر ابھی بھی لوگ روایت سے انحراف کرتے ہوئے بغاوت کے راستے پر چل نکلتے ہیں۔

شعیب خالق نے محض معاشرے کے ایک فرد کے عمل کو زیر بحث لا کر معاشرے کی ان خرابیوں کا ذکر ہی نہیں کیا بلکہ اس تمام تر صورتحال کو بھی واضح کیا ہے جو ان تمام حالات کا موجب بنتی ہے۔

شعیب خالق نے جنسی مسائل کی عکاسی کرتے ہوئے معاشرے کے ایسے افراد جو بظاہر بہت معزز نظر آتے ہیں ان افراد کے اصل چہرے کو بے نقاب کرتے ہوئے ان کو معاشرے کے سامنے لایا ہے۔ اس طرح اس ناولٹ "آنٹی" کے اندر اہم ضمنی کردار "اکو" کا ہے۔ جو بظاہر بہت معزز انسان نظر آتا ہے۔ وہ محلے کے ارد گرد کے لوگوں کا محافظ ہے۔ مشکل حالات میں لوگوں کے کام آتا ہے لیکن یہی فرد معاشرے کے اندر لوگوں کے لیے ایک سانپ کی حیثیت رکھتا ہے۔ بظاہر معزز نظر آنے والا یہ فرد لوگوں کی مدد کے بہانے لوگوں کا ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے۔

شعیب خالق اپنے اس ناولٹ کے ذریعے معاشرے کے ایسے انسانوں کو سامنے لاتے ہیں جو چہرے کے اوپر معصومیت کا غلاف چڑھا لیتے ہیں اور سماج کو دکھانے کے لیے اچھے ہوتے ہیں۔ لیکن یہی افراد معاشرے میں لوگوں کو نقصان پہنچانے کا موجب بنتے ہیں۔

"وہ خود کو محلے کا ذمہ دار، ہوشیار اور دلیر محافظ کہلوانا پسند کرتا ہے۔ محلے کی سیاست میں شطرنجی انداز چلتا ہے۔ اس کی دن بھر کی مصروفیت میں کم عمر لڑکوں کی لڑائیاں کروانا یا چھڑانا، دکان داروں کے ادھار کی پھنسی رقم اپنی رنگ بازی سے انہیں دلوانا، لڑکے لڑکیاں کے معاشقوں کی خبر رکھنا، محلے کی لڑکیوں کے تعاقب میں باہر سے آنے والے لڑکوں کو پکڑ کر پیسے چھین لینا یا ان میں سے کسی لڑکیوں جیسے لڑکے کو چہات میں پرو کر اپنی شاگردی کی مہر ثبت کرنا اس کے محبوب مشغلوں میں شامل ہے۔"(۳۰)

شعیب خالق نے "اکو" کے کردار کے ذریعے معاشرے کے بظاہر شریف نظر آنے والے شخص کے اصل چہرے کو سماج کے سامنے لایا ہے۔ اور اپنے ناولٹ کے اندر یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ معاشرے کے اندر بظاہر شریف نظر آنے والا شخص اندر سے زہریلے سانپ کی مانند ہے۔

منشیات کا استعمال:

"رائیل سیلوٹ" شعیب خالق کا ایک ایسا افسانہ ہے جس میں جدید معاشرے کے اہم مسئلے منشیات کے بڑھتے ہوئے رحجان کو دکھایا گیا ہے۔ جدید معاشرے کی نوجوان نسل اس کی جانب تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ خاص کر تعلیمی اداروں کے اندر طلباء منشیات جیسی سرگرمیوں میں مبتلا ہیں جس سے ان کی صلاحیت متاثر ہو رہی ہے۔ مختلف اداروں کی اگر رپورٹ کا جائزہ لیا جائے تو ایک اندازے کے مطابق پاکستان میں ۴۶ فیصد مرد اور ۹ فیصد خواتین منشیات خاص کر سگریٹ نوشی جیسی مہلک بیماری میں مبتلا ہیں ۔ مجموعی طور پر ۵۷ کروڑ روپے سگریٹ نوشی کی نظر روزانہ کی بنیاد پر ہو رہے ہیں۔ فیشن کے طور پر نوجوان نسل کے اندر منشیات کا استعمال آئے روز بڑھتا جارہا ہے۔ نوجوان لڑکوں کے ساتھ ساتھ لڑکیوں بھی کثیر تعداد میں منشیات میں ملوث ہیں۔ تمباکو، شراب، افیون، شیشہ، چرس اور سگریٹ نوشی کا استعمال جدید معاشرے کے اندر موجود ہے۔

ترقی یافتہ ممالک کے مقابلے میں ترقی پذیر ممالک جیسے پاکستان ، بھارت، بنگلہ دیش، سری لنکا میں منشیات میں زیادہ آبادی ملوث ہے۔ پاکستان میں تیرہ سے چوبیس سال کی عمر والے لوگوں کی تعداد زیادہ ملوث ہے۔ ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی لکھتے ہیں۔

> "سگریٹ نوشی ایک فیشن بن گیا ہے۔ اب مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین بھی سگریٹ پینے لگی ہیں۔ عورتوں کے لیے ہلکے اثر والے مخصوص برانڈ کے سگریٹ بازار میں دستیاب ہیں۔ عورتوں میں سگریٹ نوشی مغربی ممالک کے فیشن ایبل حلقوں میں کی جاتی ہے۔ مشرق کی خواتین بہت حد تک اس وباء سے محفوظ تھیں لیکن اب مشرقی ممالک میں بھی مغرب کی تقلید کی بیماری اس حد تک پھیل گئی ہے کہ لوگ اس کے مضر اثرات پر سوچے سمجھے بغیر اور ان کی پرواہ کیے بغیر اندھی تقلید کیے جا رہے ہیں۔"(۳۱)

اپر کلاس لوک آس کرسٹل، ہیروئن کے علاوہ مختلف ادویات کے استعمال میں ملوث ہیں۔ مڈل کلاس کے لوگ زیادہ تر نسوار، سگریٹ، چرس، پان، گٹکا، اور دیگر ڈرگز کے عادی ہوتے ہیں۔

غیر تعلیم یافتہ افراد کے ساتھ ساتھ تعلیم یافتہ افراد بھی جو ملک و قوم کے مستقبل ہیں وہ بھی اس خطرناک جرم میں ملوث پائے گئے ہیں۔ حتیٰ کہ منشیات سپلائی کرنے والے گروہوں کو تعلیمی اداروں کے اندر ملوث پایا گیا ہے۔اس سے نوجوانوں کی صحت داؤ پر لگ گئی ہے۔

منشیات کے نقصانات کے حوالے سے دیکھا جائے تو سب سے زیادہ نقصان دل، جگر، معدہ اور پھیپھڑوں کو ہوا ہے اور اس سے ہزاروں لوگ دیمک کی طرح آہستہ آہستہ ختم ہو جاتے ہیں۔

جدید معاشرے کے اندر جہاں بہت سے فائدے میسر ہوئے ہیں وہیں مشینی دور کے آنے کے بعد معاشی بد حالی جیسے مسائل بھی ابھر کر سامنے آئے ہیں۔ مشینی دور سے بے روز گاری اور غربت جیسے مسائل پروان چڑھے ہیں جس سے افراد کے اندر مایوسی اور نفسیاتی مسائل پیدا ہوئے ہیں۔ لوگ ان مسائل کو کم کرنے کے لیے اور اپنے غموں سے نجات حاصل کرنے کے لیے بھی ان نشہ آور منشیات میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

سوشل میڈیا اور الیکٹرونک میڈیا کی وجہ سے بھی نوجوان نسل منشیات کے استعمال کی طرف تیزی سے راغب ہو رہی ہے۔ سوشل میڈیا میں سرے عام منشیات استعمال کرتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے۔ فلموں اور ڈراموں سے کرداروں کے ذریعے منشیات کو استعمال کیا جاتا ہے۔ لباس، میلہ اور دیگر چیزوں کی نقل کے ساتھ ساتھ نوجوان طبقہ منشیات کے استعمال کی جانب بھی راغب ہوتا نظر آرہا ہے۔

شعیب خالق نے معاشرے کے اندر منشیات کے بڑھتے ہوئے رجحان کی طرف توجہ مرکوز کروانے کی کوشش کی ہے۔ ان کا افسانہ "رائل سیلوٹ" میں منشیات کے استعمال کی عکاسی کی گئی ہے۔

شعیب خالق کے مطابق جدید دور کے اندر منشیات کا استعمال اس قدر بڑھ گیا ہے کہ لوگ ایک دوسرے کو تحائف میں شراب کی بوتلیں دینا پسند کرتے ہیں۔ اس کی عکاسی ان کے افسانے "رائل سیلوٹ" کے اندر بھی ملتی ہے۔ لوگ ایک دوسرے کی مدد کے بدلے اور احسان کا بدلہ اتارنے کے لیے بھی شراب کی بوتلیں تحفے کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

اس افسانے کا مرکزی کردار ایک ٹریولنگ ایجنسی کے "رینٹ اے کار" سیکشن میں جونئیر آفیسر کا ہے۔ غیر ملکی ائیر پورٹ ٹو ائیر پورٹ کی سروس اس ایجنسی سے حاصل کرتے ہیں۔ واحد متکلم کا کردار ایک غیر ملکی ایلفریڈ "کوہن" کو ائیر پورٹ سے رسیو کرتا ہے۔ اور ڈرائیور بن کر اس کو ادھر ادھر لے کر جاتا ہے۔ اس کی خدمت کرتا ہے اور وہ اس کے بدلے میں اس کو شراب کی بوتل نہایت قیمتی تحفہ سمجھ کر دے دیتا ہے۔ جس کو وہ قبول کر لیتا ہے اور قبول کرتے وقت یہ سوچتا بھی ہے کہ اس بوتل کے فروخت سے اس کی ماں

کی ادوایات بھی خریدی جاسکتی ہے۔

> "اس نے لمبا ہاتھ بڑھا کر میز سے ایک ڈبے میں پیک رائل سیلوٹ کی بوتل میری طرف بڑھائی اور منہ کی گہرائی سے بولا، ایک دوست کے لیے ایک دوست کی جانب سے۔"(۳۲)

منشیات اور اس کا استعمال ایک سماجی برائی ہے۔ منشیات کی پیداوار اور اس کے نتیجے میں اثرانداز ہونے والے عوامل سے افراد شدید متاثر ہو رہے ہیں۔ بزدلی، کمزور قوت ارادی، بے چینی اور اضطرابی کی کیفیت جیسے مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔ لیکن ان تمام نقصانات کے سامنے ہونے کے باوجود بھی منشیات کا استعمال اس قدر بڑھ رہا ہے کہ جدید معاشرے کے اندر اس کو برائی نہیں سمجھا جاتا بلکہ قیمتی تحفہ سمجھ کر تحفے کے طور پر دینے کا رواج آگیا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہونا چاہیئے۔ شعیب خالق نے اپنے افسانے "رائل سیلوٹ" میں اس جانب توجہ مبذول کروائی ہے۔

منشیات کا استعمال چاہے کسی بھی رنگ میں ہو اور منشیات کی چاہے کوئی بھی قسم ہو اس نے ذہنی سکون کو ختم کر دیا ہے۔ والدین کی پریشانی آئے روز بڑھتی جا رہی ہے۔ یہ ہمارے جدید معاشرے میں پائے جانے والی برائیوں میں سے ایک بڑی برائی بن چکی ہے۔ منشیات کے استعمال کی بنیادی وجہ دین سے دوری اور اس کے استعمال کے بعد اس کے نقصانات سے بے خبری ہے۔ اس طرح جدید معاشرے میں مختلف اقسام کے نشے با آسانی سے مل جاتے ہیں جس کی وجہ سے لوگ دولت کی لالچ اور راتوں رات امیر بننے کے چکر میں منشیات کا کاروبار کر رہے ہیں۔

جدید معاشرے کے اندر منشیات کا استعمال آئے روز قیمتی جانوں کو ختم کر رہا ہے۔ منشیات کے استعمال کی وجہ سے لوگوں میں حادثاتی اموات کی شرح میں اضافہ ہو رہا ہے۔ والدین جو بچوں کو بڑی قربانیوں کے بعد پال پوس کر بڑا کرتے ہیں ان کے ارمان خاک میں مل جاتے ہیں۔ ان کی پریشانیوں کا ذکر شعیب خالق نے اپنے افسانے "بس ایک سگریٹ" میں کر کے اس اہم مسئلے کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے۔

> "دو سال پہلے جب دفتر سے واپسی پر میں نے زیادہ ہی پی ہوئی تھی اور میری کار ایک درخت کو جا لگی تھی۔ مجھے ۲۷ گھنٹے کومے میں لیے رہی۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ میں بچ گیا ہوں مگر دعا کی جائے کہ ہوش میں آنے کے بعد میں وہی ہوں جو ایکسیڈینٹ سے پہلے تھا۔ میرا باپ وہ تمام وقت ہسپتال میں رہا۔ اور میں نے ساری زندگی انہیں نماز پڑھتے

ہوئے نہیں دیکھا تھا مگر بیوی نے بتایا وہ ہسپتال کی مسجد میں نماز ادا کرتے اور رو رو کر
میرے لیے دعا مانگتے رہے تھے۔"(۳۳)

جدید معاشرے میں منشیات کے استعمال کے بعد حادثاتی اموات کی شرح میں اضافہ ہو رہا ہے۔ شعیب خالق نے اس قسم کے مسائل سے ملتے ایک اور اہم مسئلے کی جانب توجہ مبذول کروا کے قاری کی توجہ اس جانب کروائی ہے تاکہ اس حوالے سے اقدامات ہوں۔

جدید معاشرہ کے اندر دیکھا گیا ہے کہ اکثر نوجوان منشیات کا استعمال کر کے جب ڈرائیونگ کرتے ہیں تو اس سے ان کی اپنی زندگی تو خطرے میں ہوتی ہی ہے اس کے علاوہ دوسروں کی زندگیوں کو بھی ختم کر دیتے ہیں۔ اس سے والدین کی پریشانیوں میں اضافہ ہو رہا ہے اور والدین اسی دکھ اور پریشانی میں مبتلا ہو کر اکثر جان کی بازی بھی ہار دیتے ہیں۔

ہر والدین اپنے بچوں کی اچھی تربیت اور ان میں اچھا اخلاق پیدا کرنا چاہتے ہیں لیکن بعض اوقات انجانے طور پر والدین ہی بچوں کو برے راستے پر چلانے کا موجب بن جاتے ہیں۔ کیونکہ ہر بچہ وہی کچھ سیکھتا ہے جو اس کے گھر میں ماحول ملتا ہے۔ بعض والدین ایسے بھی ہوتے ہیں جو خود تو نشے کے عادی ہوتے ہیں۔ لیکن وہ اپنے بچوں کو نشے کا عادی بنانا نہیں چاہتے لیکن بچے اپنے والدین کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اکثر انہی راستوں پر چل نکلتے ہیں۔ شعیب خالق نے اپنے افسانے "بس ایک سگریٹ" میں والدین کی بے دھیانی اور انجانے طور پر اپنے ہی بچوں کو غلط راہ پر جانے کا موجب بننے والے اسباب کی عکاسی کی ہے۔

"انہی دنوں باپ بوتل گھر لا کر بھی پینے لگا۔ بچی ہوئی شراب کہیں چھپا کر رکھ جاتا اور میری نگاہ نے وہ جگہ بھی تلاش کر لی اس میں سے ایک گھونٹ نکالا اور ایک گھونٹ پانی ڈال کر واپس اسے اپنی حالت میں رکھ دیتا۔ ایک دفعہ شاہد پانی زیادہ بوتل میں ڈل گیا یا ایک ساتھی کے لیے بھی گھونٹ زیادہ نکال لیا۔ پکڑا گیا مگر جس سہولت کے ساتھ میرا باپ جھوٹ بولتا تھا ویسے ہی میں نے کم عمری پر گھونٹ کی چوری کے الزام کا دفاع یوں کیا کہ باپ بیچارہ گھونٹ پی کر رہ گیا۔"(۳۴)

بچے ہمیشہ وہی کچھ سیکھتے ہیں جو ان کے والدین افعال سرانجام دیتے ہیں۔ بچے اپنے والدین کا عکس ہوتے ہیں۔ بچوں کی شخصیت کی تعمیر میں والدین کا بہت بڑا اور اہم کردار ہوتا ہے۔ گھریلو ماحول بچوں میں شخصیت کا نکھار پیدا کرتا ہے۔ لیکن بعض والدین ہی بچوں کی شخصیت کی تعمیر میں بگاڑ پیدا کرنے کا موجب

بنتے ہیں کیونکہ بچہ وہی فعل سرانجام دیتا ہے۔

مثال کے طور پر ڈاکٹر کے بچے ادویات اور مختلف بیماریوں کے حوالے سے بات کرتے ہیں۔کسان کے بچے فصلوں اور کھیتی باڑی پر گفتگو کرتے ہیں۔ بعض اپنے ہی والدین کی دیکھا دیکھی نشے کی طرف راغب ہو جاتے ہیں۔

شعیب خالق نے بھی اپنے افسانے "بس ایک سگریٹ" میں اس بات کی عکاسی کی ہے کہ جدید معاشرے کے اندر برائیوں میں اضافہ کرنے کا ذمہ دار صرف معاشرہ ہی نہیں ہے بلکہ بعض والدین کی کوتائیاں بھی بگاڑ کا موجب بنتی ہیں۔ دن بدن منشیات کے استعمال کا اضافہ نسل در نسل وراثت میں نوجوانوں کو ملتا جارہا ہے۔نسل در نسل منشیات کی منتقلی نے معاشرے کے اندر بہت فروغ پایا ہے۔ جدید معاشرے کے اندر لوگ لطف اندوز ہونے کے لیے اور خوشی کے لمحات کو منانے کے لیے شراب پی کر فخر محسوس کرتے ہیں۔ آج کے جدید دور کے اندر منشیات کا استعمال اس حد تک بڑھ چکا ہے کہ نوجوان نسل صحت مند سرگرمیوں کی بجائے منشیات کو ترجیح دیتے ہیں۔

خواتین کا استحصال:

افسانہ "پاؤں کی جوتی" میں شعیب خالق نے جدید معاشرے میں خواتین کے استحصال کا ذکر کر کے اس اہم مسئلے پر آواز اٹھائی ہے۔ خواتین بطور ماں، بہن، بیٹی اور بیوی کے مختلف روپ رکھتی ہیں۔ لیکن بطور عورت ابھی بھی اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ حالانکہ عورت محبتوں میں جکڑی ہوئی، چاہت اور محبت کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ معاشرے کی تعمیر میں عورت بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ لیکن ان سب کے باوجود بھی خواتین جدید معاشرے کے اندر بھی استحصال کا شکار ہیں۔ ویسے تو پوری دنیا ہی میں عورت مختلف قسم کے مسائل کا شکار ہے مگر پاکستان میں خواتین کے ساتھ ابھی بھی جبر اور امتیازی سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ کہنے کو تو ہم اکیسویں صدی میں آگئے ہیں لیکن ابھی بھی خواتین کے مسائل جوں کے توں ہیں۔ اگر روزگار کے حوالے سے دیکھا جائے تو مردوں کی نسبت عورتوں کو روزگار حاصل کرنے میں پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مردوں کی نسبت عورتوں کو اس دور میں بھی کم معاوضہ دیا جاتا ہے۔

معاشرتی تعصب، تشدد، رسم ورواج کی پابندی، غیرت کے نام پر قتل، اغوا، تعلیم کے حصول اور کھیلوں میں شمولیت میں رکاوٹ یہ وہ تمام مسائل ہیں جو ہمارے جدید معاشرے کے اندر خواتین کو درپیش ہیں۔ ان حالات میں بہتری اس وقت تک نہیں لائی جاسکتی جب تک ہر شعبہ کے اندر عورتوں کے لیے درپیش

تمام سیاسی، سماجی اور معاشی رکاوٹوں کو دور کرنے کے لئے مناسب اقدامات کا بندوبست نہ کیا جائے۔

خواتین کا زیادہ تر استحصال قبائلی اور جاگیر درانہ نظام میں ہوتا ہے۔ کیونکہ ان علاقوں میں رسم ورواج بہت زیادہ ہوتے ہیں اور ان کی آزادانہ زندگی گزارنے کی راہ میں رکاوٹ ہوتے ہیں۔ عورت کی حیثیت ان علاقوں میں ایک شئے سے کم نہیں ہوتی۔

انسانی وجود کی اہمیت نہیں ہوتی اور عورتوں پر تشدد اس طرح کیا جاتا ہے جیسے وہ لوہے کی بنی ہوئی ہے۔ ہمارے جدید معاشرے کے اندر بھی عورت کی حیثیت ایک مکھی جیسی ہے۔ وجود اشرف المخلوقات کا ہو یا حقیر جان کا دونوں کی سطحیں برابر ہوتی ہیں۔ جس طرح ایک حقیر جان کو اپنی زندگی پر کوئی اختیار نہیں ہوتا اسی طرح ہمارے جدید معاشرے کے اندر بھی عورت کا اپنی ذات پر کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ عورت پوری زندگی اچھی یا بری عورت بننے کے چکر میں معاشرے کے بنائے گئے اصولوں کے مطابق اپنی پوری عمر گزار دیتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی اس کو اچھی یا بری عورت ہونے کا صلہ مرد یا معاشرہ دیتا ہے۔

بادشاہ منیر بخاری لکھتے ہیں۔

> "معاشرے میں عورت کو ہمیشہ دوسرے درجے کی مخلوق تصور کیا گیا۔ یا اسے وہ مخلوق سمجھا گیا کہ جس سے کام لیا جائے اسے استعمال کیا جائے یا پھر اپنے جذبات اور کہر کا نشانہ بنانے کا ذریعہ جانا گیا۔ یا تو عورت کو دیوی بنایا گیا یا اسے طوائف۔ بحیثیت انسان عورت جس طرح عالمی ادب میں اس کا مقام ہے وہ مشرقی معاشرے کے اس غلط تصور کے نظر ہو گیا۔"(۲۵)

جدید معاشرے کے اندر ابھی بھی خواتین کو تعلیم کے حصول کا مسئلہ درپیش ہے۔ خواتین جدید معاشرے کے اندر بھی آزادانہ طور پر تعلیم حاصل نہیں کر سکتیں۔ خواتین کی شرح خواندگی کو بڑھانے کے لیے حکومت اور سماج نے خصوصی اقدامات اور بجٹ میں بھی اضافہ نہیں کیا۔ ابھی بھی بہت سے ایسے علاقے ہیں جہاں خواتین کا تعلیم حاصل کرنا گناہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ عورتوں کے حقوق اور آزادی سے متعلق مواد کو نصاب میں شامل کیا جائے اور عورتوں کی تنظیم سازی کو قانونی حیثیت دے کر مردوں کے مساوی لانے کی کوشش کی جائے۔ جدید معاشرے کے اندر بھی مرد عورت کو مکار چیز سمجھتا ہے کہ عورت پر جس طرح بھی جبر یا استحصال کیا جائے تو عورت ہر مشکل سے نکلنے کا حل جانتی ہے اور عورت سے جس طرح کا بھی سلوک رکھا جائے وہ اس کی مستحق ہے۔

محض مرد ہی عورت کا استحصال نہیں کرتا بلکہ انسان کے ہاتھوں انسانیت کا استحصال بھی جاری ہے۔ طاقت ور کمزور پر اور حاکم محکوم پر بری طرح سے تسلط پا چکا ہے۔ اس سے معاشرہ عدم توازن کا شکار ہوا۔ آزادانہ سوچ نے مرد کو تو غیرت مند اور شریف ہی سمجھا لیکن آزادانہ سوچ نے عورت کو بے غیرت قرار دیا۔ اسی سوچ کی عکاسی شعیب خالق نے اپنے افسانے "پاؤں کی جوتی" میں کچھ یوں کی ہے۔

"سر جی عورت بڑی مکار چیز ہے۔ اسے دس دروازوں کے پیچھے تالا لگا کر بھی قید رکھو تو وہ سارے تالے کھولنا جانتی ہے۔ عورت اس قدر چالاک چیز ہے سر جی کدھر بیٹھے ہو "گوگے" کا جملہ ختم ہوتے ہی "چیتا" فوراً بولا۔ سر جی عورتیں آزاد ہو گئیں تو سمجھو مرد بے غیرت ہو گئے۔ ڈی پورٹ ہونے سے پہلے میں نے چار سال گزارے ہیں ادھر عورت آزاد ہوئی تو رشتوں کی تمیز ہی ختم ہو گئی۔ شرم آتی ہے سر جی بتاتے ہوئے بہن بھائی، باپ بیٹی توبہ توبہ اللہ معافی۔۔۔"(۳۶)

جدید معاشرے کے اندر مرد عورت کو ایک مکار چیز سمجھتا ہے۔ مرد سمجھتا ہے کہ معاشرے کے اندر بے غیرتی اور رشتوں کی تمیز کے خاتمے کی ذمہ دار عورت ہے۔ معاشرے کے اندر تمام تر خرابیوں اور ان کے مسائل کی ذمہ داری کا قصور وار صرف عورت کو سمجھا جاتا ہے۔ شعیب خالق نے جدید معاشرے کے اندر مردوں کے ذہن کی عکاسی کی ہے کہ مرد خود کو شریف اور غیرت مند تصور کرتا ہے اور معاشرے کے اندر جتنی بھی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اس میں مرد اپنے آپ کو قصور وار نہیں سمجھتا چاہے وہ عورت کے ساتھ جیسا بھی سلوک رواں رکھے وہ سمجھتا ہے کہ عورت ایک لوہے کی مانند ہے۔ جو اس تمام تر صورتحال سے نکل جاتی ہے۔ جس طرح یورپ میں عورت آزاد ہے۔ اس طرح ہمارے معاشرے میں بھی عورت کی وہی حیثیت ہے۔ عورت ماں بہن اور بیوی جس روپ میں ہے وہ آزادانہ طور پر زندگی بسر کر رہی ہے۔

شعیب خالق نے جس دور میں اپنی ادبی اور معاشرتی خدمات کا آغاز کیا۔ اس میں انسانیت مجروح ہو رہی ہے۔ محض مرد ہی عورت کا استحصال نہیں کر رہا بلکہ معاشرے کے اندر لوگوں کی سوچ بھی عورت کے استحصال کا باعث بنتی ہے۔ اس سے معاشرے کے اندر عدم توازن پیدا ہوا اور بے پناہ مسائل میں اضافہ ہوا ہے۔ اس کی اہم وجہ تعلیم اور شعور و آگاہی کا فقدان ہے۔ شعیب خالق نے معاشرتی مسائل کی بھرپور عکاسی اس طرح کی ہے:

"او سر جی لگتا ہے آپ کو چڑھ گئی ہے۔ پتہ نہیں قرآن میں یا حدیث میں یہ بات ہے کہ

عورت ایک فتنہ ہے۔ بس قرآن اور رسول پر ہمارا ایمان بڑا پکا ہے سر جی بس کوئی اور بات کرو۔"(۳۷)

تعلیم اور شعور و آگاہی کے فقدان کی وجہ سے لوگوں کی سوچ وہیں کی وہیں ہے۔ تعلیم کا شعور نہ ہونے کے باعث لوگ قرآن یا حدیث کے اصل مقصد کے مفہوم سے نا آشنا ہیں۔ اور نہ ہی لوگ قرآن یا حدیث کے اصل مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کہیں سے ایک جملہ سن کر اس کے مختلف مفہوم نکال کر اپنی سوچ اور اپنی پسند کے مطابق ڈال لیتے ہیں جس طرح اس افسانے کے اندر بغیر جانے اور سمجھے عورت کو فتنہ کہہ دیتا ہے۔ واحد متکلم کے مرکزی کردار کے مطابق قرآن میں یا حدیث میں یہ بات آگئی ہے کہ عورت ایک فتنہ ہے تو وہ عورت کو ایک فتنہ ہی تصور کرتا ہے۔ مرکزی کردار کے مطابق معاشرے کے اندر تمام تر برائیوں کی ذمہ دار یہ عورت ہی ہے۔ اس لیے عورتوں کو پاؤں کی جوتی ہی سمجھنا چاہیے۔ اگر پاؤں کی جوتی نہ سمجھا جائے تو وہ فتنہ اور فساد پھیلانے کا باعث بنتی ہے۔ جدید دور کے اندر خاص کر متوسط طبقے کی عورت کی حیثیت ابھی بھی پاؤں کی جوتی کے برابر سمجھی جاتی ہے۔ مردانہ سوچ نے عورت کے حوالے سے اپنی سوچ کو جوں کا توں ہی رکھا ہوا ہے جس سے عورت اعصابی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر اسلم جمیل رقمطراز ہیں:

"نچلے متوسط طبقے کی عورت کی زندگی زیادہ تلخ ہے انہیں بچپن سے ہی گھروں میں بند کر کے رکھا جاتا ہے باپ اور بھائیوں کا رعب، حالات کا جبر، زندگی کی محرومیاں، غربت ان کے اعصاب پر نا قابل برداشت بوجھ ڈالتے ہیں۔ گھریلو ماحول سے بغاوت اکثر صورتوں میں ناممکن ہوتا ہے باہر کی دنیا میں وہ ایک دن کے لیے بھی محفوظ نہیں رہ سکتی۔ یوں نوجوان لڑکیوں کے لیے حالات سے فرار کا ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے اور وہ ہے اعصابی بیماریاں، ہسٹیریا، بے ہوشی کے دورے یا جسم کا شل ہو جانا۔"(۳۸)

شعیب خالق معاشرے میں عورت کے ساتھ روا رکھا جانے والا سلوک اور اس کے مسائل کو زیر بحث لاتے ہیں اور یہ باور کروانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح معاشرہ عورت کے راستے میں رکاوٹ بنتا ہے۔ رسم ورواج کے چکر میں معاشرہ عورت کو الجھائے رکھتا ہے۔ شادی کے بعد عورت لباس، نام اور بعض اوقات اپنے رہن سہن تک کو تبدیل کر دیتی ہے اور اپنے شوہر کی تابعدار بیوی بن کر رہنے کی کوشش کرتی ہے لیکن اس کے باوجود بھی انسانی رویے اسی عورت پر براہ راست اثرات مرتب کرتے ہیں لیکن جدید

معاشرے کے اندر ایک پڑھی لکھی اور باشعور لڑکی بھی معاشرتی جبر کا شکار ہو جاتی ہے اور اپنی زندگی انجانے راستوں پر گزارنے کے لیے مجبور ہوتی ہے۔

جدید معاشرے کے اندر ابھی بھی لوگوں کی یہی سوچ ہے کہ شادی کے بعد عورت کا وہی گھر ہے۔ اس گھر سے اس کا جنازہ ہی نکلے گا۔ اس تصور کی بنا پر ایک پڑھی لکھی اور باشعور لڑکی بھی اپنے شوہر کے جبر کو برداشت کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ شعیب خالق نے اپنے افسانے "بس ایک سگریٹ" کے اندر ایک ایسی عورت کی عکاسی کی ہے جو اپنے شوہر کی تابعدار اور دو بچوں کی ماں ہے۔ شوہر کی بیزاری کے باعث وہ اپنی اصل منزل کے حصول کے لیے کوشاں ہے۔ اس افسانے کی مرکزی کردار اپنے شوہر کے ظلم و ستم کو اس لیے برداشت کرتی ہے کہ وہ اس کی بیوی ہے اور اس کے بچوں کی ماں ہے۔

"نشے میں کبھی پیار سے اور کبھی انتہائی غصے کے ساتھ کتوں کو ننگی گالیاں نکالتا گیٹ میں داخل ہوتا۔ گھر کے اندر بھی ماں کے ساتھ کبھی خوش کن آواز میں باتیں کرتا اور کبھی کرخت لہجے اور اونچی آواز میں دھاڑتا۔"(۳۹)

شادی پوری عمر کا ساتھ ہوتا ہے۔ اس میں لڑکے اور لڑکی کی ذہنی ہم آہنگی ہونا بھی ضروری ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو زندگی کا سفر طے کرنا محال ہوتا ہے سفر کو خوشگوار بنانے کے لیے گاڑی کے دونوں پہیوں کی نہایت اہم ذمہ داری ہوتی ہے۔ خوشگوار زندگی کا سفر ہو تو آنے والی نسلوں کی تربیت بہتر اور احسن انداز میں کی جا سکتی ہے۔ اسی موضوع کو احاطہ تحریر میں کرتے ہوئے شعیب خالق نے اپنے افسانے میں شادی کے معاملات میں خانگی مسائل کی طرف توجہ دلوائی ہے کہ اکثر والدین کی مرضی سے تمام رشتے طے پائے جاتے ہیں جو بعد میں ناچاکی کی بنا پر عدم مطابقت کا باعث بنتے ہیں۔ کیونکہ ذہنی ہم آہنگی نہ ہونے کی بنا پر عدم مطابقت کا باعث بننے کے باعث دو افراد کے ساتھ ساتھ دو خاندانوں کے مسائل میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ بعض اوقات والدین اپنی بیٹی کی شادی ایک ایسے شخص کے ساتھ کر دیتے ہیں جو نشے کا عادی ہوتا ہے اور نشہ نہ ملنے پر وہ بیوی کو تشدد کا نشانہ بناتا ہے۔

ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش لکھتی ہیں۔

"عورت معاشرے کی "نیک پروین سے یہ توقع رکھی جاتی ہے جو ہر لحاظ سے مرد کے لیے سود مند ہوتا ہے۔ معاشرے کی "نیک پروین" سے یہ توقع رکھی جاتی ہے۔ کہ وہ مرد کے لیے محبوبہ سے لے کر باندی تک ہر کردار خوشی خوشی اور خوش اسلوبی سے ادا

کرنے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہو۔اس مقصد کے لیے اسے رشتوں سے غیر مرئی زیورات پہنائے جاتے ہیں وہ ماں، بہن، بیٹی، بیوی جو کچھ بھی ہو ہمیشہ مردانہ خواہشات کے تابع رہتی ہے۔اس لیے ہمارے معاشرے میں عورت کا بحیثیت دوست تصور مقصود ہے۔ دوستی یک طرفہ نہیں دو طرفہ ہوتی ہے۔دوستی میں جذباتی لین دین برابری کی سطح پر ہوتا ہے جبکہ بقیہ تمام پاکیزہ اور خوبصورت رشتوں میں مرد فائدے میں اور عورت خسارے میں رہتی ہے۔"(۴۰)

بعض اوقات نشہ زیادہ پینے کی وجہ سے اور اپنی سوجھ بوجھ کھو دینے کی وجہ سے اپنی ہی بیوی کو تنقید کا نشانہ بناتا ہے۔ بلاوجہ وہ کرخت اور اونچی آواز میں دھاڑتا ہے۔ شعیب خالق نے نشہ آور افراد کی ذہنی حالت کی عکاسی کی ہے اور یہ بات واضح کرنی کی کوشش کی ہے کہ انسان کی راہ میں انسان ہی رکاوٹیں پیدا کرتا ہے عورت کے استحصال کی وجہ سے مرد اپنی طاقت کا غلط استعمال کرتے ہوئے اس کے حقوق سلب کرلیتا ہے۔اس طرح خواتین کے لیے جتنے بھی مسائل پیدا ہوئے وہ زیادہ تر مرد کے ہی پیدا کردہ ہیں۔ محض مرد ہی عورت کا استحصال نہیں کر رہا بلکہ جس کے پاس اگر کچھ اختیار ہے وہ تو وہ اپنے اختیارات کا ناجائز فائدہ اٹھا کر انسانیت کو مجروح کر رہا ہے۔

ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش لکھتی ہیں۔

"عورت ہر معاملے میں زیادہ مجبور، بے بس اور پا یا زنجیر ہوتی ہے جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس کے سماج گھر رشتوں حتی کہ وجود تک کی تشکیل مرد کے ساختہ قواعد و ضوابط، مرد کی عائد کردہ پابندیوں اور قدغنوں اور مرد کے مدون کردہ قوانین کے مطابق ہوتی ہے۔ عورت کے انفرادی وجود کی احساس اس کی شخصیت کی نمو اور ذات کی متنوع جات کے فطری تقاضوں کو ملحوظ رکھنے کے بجائے اسے ایسے سانچے میں ڈھالا جاتا ہے یا اس سے ایسے سانچے میں ڈھلنے کی توقع کی جاتی ہے جو ہر لحاظ سے مرد کے لیے سود مند ہوتا ہے۔"(۴۱)

جدید معاشرے میں خواتین کے استحصال کی بنیادی وجہ "معیار تعلیم" سے محرومی ہے۔ کم عمری میں شادی، صحت اور بے روزگاری جیسے مسائل کا شکار ہونے کے باعث خواتین مردوں سے بہت پیچھے رہ گئیں ہیں۔ یہ صورتحال دیہی معاشرے تک محدود نہیں ہے بلکہ شہروں کے اندر بھی یہ مسئلہ بہت زیادہ پھیل گیا

ہے۔ آج کی دنیا میں انسان جوں جوں ترقی کی منازل طے کرتا جارہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انسانی سماج میں گھناؤنے جرائم میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ ہمارے معاشرے کے اندر اکثر خواتین کو آئے دن جنسی تشدد کا سامنا رہتا ہے۔ مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والی ماں، بہن، اور بیٹیوں کی عزتیں داؤ پر لگی ہوئی ہیں۔ ان میں ایک اہم جرم خواتین کا جنسی استحصال بھی ہے۔اس کی عکاسی شعیب خالق نے اپنے ناولٹ "آنٹی" میں بھی کی ہے۔ افسانے کی مرکزی کردار "عابدہ" جو اپنے عاشق "راجو" کے ساتھ تعلقات تو قائم کر لیتی ہے لیکن "راجو" عابدہ" کو جنسی ہوس کا نشانہ بنا کر سماج کے اندر اکیلا چھوڑ جاتا ہے۔ حالانکہ "عابدہ" سماج کی پرواہ کیے بغیر اس سے تعلقات قائم کر لیتی ہے۔ لیکن اس احساس مسئلے کی ذمہ دار صرف ایک عورت کو ٹھہرایا جاتا ہے۔ شعیب خالق نے اپنے اس ناولٹ میں سماج کے معاشرتی اقدار کی عکاسی کی ہے کہ جنسیت کا شکار ہونے والی عورت کو بد چلن کہا جاتا ہے اور جنسی ہوس کا نشانہ بنانے والے مرد معاشرے کے اندر پاک دامنی کا غلاف چڑھائے زندگی بسر کرتا ہے۔ جدید حالات اور ٹیکنالوجی کے غلط استعمال کی وجہ سے یہ مسئلہ نہایت سنگین ہوتا جارہا ہے ناولٹ کی مرکزی کردار "عابدہ" اپنے عاشق "راجو" کے چھوڑ جانے کے بعد نفسیاتی کشمکش میں مبتلا ہو جاتی ہے۔

معاشرے میں جنسی بے راہ روی کی وجہ سے بگاڑ پیدا ہوا ہے۔ عورتوں کا استحصال معاشرے میں جنسیت کے حوالے سے بھی کیا جاتا ہے۔ جدید معاشرے کے اندر فطرت سے بغاوت کر کے مرد مردوں سے اور عورت عورتوں سے جنسی خواہشات کی تکمیل چاہتی ہیں۔ ہمارے جدید معاشرے کے اندر ایک عورت اپنے شوہر کے ہوتے ہوئے اپنی مرضی سے دوسرے مردوں کے ساتھ تعلقات استوار کر لیتی ہیں جس سے پاکیزہ معاشرہ اور گھریلو نظام درہم برہم ہو کر رہ جاتا ہے۔ میاں بیوی کے رشتے بھی کمزور پڑ گئے ہیں۔ کمزور پڑنے کی وجہ سے دونوں اپنی تسکین کے لیے الگ الگ راہوں پر چل نکلے ہیں اسی کی عکاسی شعیب خالق نے اپنے ناولٹ میں اس طرح کی ہے:

> "قسم سے یہ بات میں دل سے کہہ رہا ہوں میں ادھر کبھی آؤں یا تمھیں دوبارہ دیکھ سکوں یا نہ، مگر "عابدہ" میرے سینے میں جدائی کا محبت بھرا دکھ بولنے لگا۔ قسم سے تمھیں ساری زندگی نہیں بھول سکتا۔ یہ کر کے میں نے اسے ایک جھٹکے سے بانہوں سے بھر لیا اور شاہد دو تین آنسو میری آنکھوں سے بھی ٹپکے تھے اس نے ہچکیاں بھرتے ہوئے کہا میں چلا جاؤں گا تو وہ میری یاد عمر بھر کے لیے دل سے لگائے" بٹ

صاحب" کے پیروں میں بیٹھ کر زندگی گزار دے گی۔"(۴۲)

ناولٹ "آنٹی" کی مرکزی کردار "عابدہ" اپنے شوہر کے ہوتے ہوئے بھی دوسری راہ پر چل نکلتی ہے لیکن جب "راجو" بھی دوسرے مردوں کی طرح اپنی جنسی تسکین پوری کر لیتا ہے تو اس کو وعدوں اور محبت کی آس پر چھوڑ کر چل نکلتا ہے حالانکہ آخری وقت تک اس کو اپنی محبت کا یقین دلاتا رہتا ہے۔ لیکن عمر بھر ساتھ رہنے کو ترجیح نہیں دیتا۔ جدید معاشرے کے اندر عورتوں کا سب سے بڑا استحصال جنسیت کی شکل میں کیا جارہا ہے۔ ان حالات وواقعات کے عورت پر اثرات عورتوں کی نفسیاتی کشمکش اور جنسی مسائل کی عکاسی کی ہے۔ لالہ ہر دیال لکھتے ہیں:

"زمانہ جدید کی عورت کو زمانہ گزشتہ کی ماتاؤں کی مانند اپنی عصمت وعفت کی حفاظت کر کے اپنی جنسی پاکیزگی وتقدیس کو بھی محفوظ رکھنا چاہیے۔ اس کی عظمت وشان بڑھانے کے لیے دیگر ہر طرح کی صفات اور خوبیاں اپنے اندر پیدا کر کے ہمیشہ کوشاں رہنا چاہیئے۔"(۴۳)

پاکستانی معاشرے کے اندر جہیز کا رواج اور جنسی استحصال جیسی برائیاں ابھی تک موجود ہیں جس کی وجہ سے عورتوں کی حالت ابھی تک نازک ہے۔ اس کی بنیادی وجہ سیاسی جبر اور آمریت کا نظام بھی ہے جس سے عورت کے مسائل بڑھ رہے ہیں۔ ڈاکٹر مرتضٰی علی اطہر لکھتے ہیں:

"مردوں کی بالا دستی والے سماج کی پیدا کردہ بہت سی خصوصیات دوسرے ایشیائی ممالک کی طرح یہاں بھی موجود ہیں۔ جہیز کا رواج، خانگی، تشدد، عصمت دری اور جنسی استحصال جیسی برائیاں ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔ لیکن پاکستان کی انفرادیت یہ ہے کہ سماجی جبر کے ساتھ ساتھ سیاسی جبر اور آمریت کے غیر جمہوری نظام کی موجودگی نے یہاں عورتوں کی حالت اور بھی زیادہ نازک کر دی ہے۔"(۴۴)

جنسی مسائل کی وجہ سے بچوں میں عدم تحفظ کا احساس پایا جاتا ہے۔ بچوں میں خوف کی کیفیت پائی جاتی ہے اس عمل سے والدین بھی بہت پریشان رہتے ہیں۔ والدین کو چاہیے کہ وہ گھروں کے اندر بچوں کی تربیت کریں۔ جنسی حوالے سے بچوں کو آگاہ کریں تاکہ بچوں کو اس مسئلے سے نجات مل سکے اور ان کی زندگی میں جنسی عمل کی وجہ سے جو ڈر اور خوف پایا جاتا ہے اس ڈر اور خوف سے نجات مل سکے۔ والدین کی تربیت کی

وجہ سے مجموعی سطح پر معاشرے میں بہتری آئے گی اور معاشرہ کے اندر امن وسکون کی فضا قائم رکھنے میں مدد ملے گی۔

مذہب کی ڈھال اور بے عملی:

شعیب خالق کا افسانہ "چھتری نما کہانیاں" ایک ایسا افسانہ ہے جس میں جدید معاشرے کے ایک اور اہم مسئلے بے عملی کی طرف توجہ دی گئی ہے۔ انسان اور مذہب کا تعلق کائنات کے وجود کے آنے سے ہوا ہے۔ بنی نوع انسان ہر دور میں کسی نہ کسی مذہب کے ماننے والے رہے۔ تمام مذاہب کی تعلیمات کسی نہ کسی حد تک ایک جیسی ہیں۔ اس لیے انسانی زندگی میں مذہب کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ مذہب کی بدولت ہی معاشرے میں رہنے والے افراد کو ایسے اصول میسر آتے ہیں جن کی بنا پر وہ زندگی گزارتا ہے۔

ڈاکٹر احسان اللہ خان لکھتے ہیں۔

> "مذہب کے لغوی معنی راستہ اور طریق کے ہیں مگر اس کے اصلاحی معنی وہ بنیادی فکر والدین اور عملی شکل (شریعت) جس کو ایک پیغمبر نے اپنے علاقے کے لوگوں کے سامنے پیش کیا جہاں اس کی بعثت ہوئی۔ مذہبی بنیاد میں خدا، آخرت اور رسالت کا تصور شامل ہونے کے ساتھ ساتھ ایمانداری، انصاف پسندی اور جفاکشی کا عمل بھی شامل ہوتا ہے۔ یہ ایسی قدریں ہیں جو تمام مذاہب عالم میں مشترک ہیں۔"(۴۵)

احساس ذمہ داری کا شعور بھی مذہب ہی دیتا ہے۔ فرض اور واجبات سے آشنائی مذہب ہی کی بدولت ملتی ہے انسان جب مذہب کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق زندگی گزارتا ہے تو اس وجہ سے اس کی زندگی بہتر ہو جاتی ہے۔ زندگی کی بہتری کی بدولت صحت مند معاشرے کا قیام عمل میں آتا ہے لیکن اگر وہ ان اصولوں سے روگردانی کرتا ہے تو معاشرے کے اندر افراتفری اور کشمکش کا ماحول پیدا ہو جاتا ہے۔ مذہب کی بدولت انسان کو کامیاب زندگی گزارنے کے لیے ایک مقصد حاصل ہوتا ہے جن لوگوں کا خیال ہے کہ انسانی زندگی میں مذہب کی اہمیت نہیں در حقیقت وہ مذہب کے مفہوم کو صحیح نہیں سمجھ سکتے۔ مذہب صرف مان لینے کا نام نہیں بلکہ یہ عمل کا نام ہے انسان کے کردار اور عمل سے مذہب کے ہونے کا پتا چلتا ہے مذہب انسان کی رہنمائی تو کر سکتا ہے لیکن انسان کو اپنی تعلیمات پر عمل کرنے کا پابند نہیں بنا سکتا۔ اب اس پر منحصر ہے کہ وہ مذہبی تعلیمات پر عمل کر کے کامیابی حاصل کر لے یا مذہبی تعلیمات سے روگردانی کر کے بھٹک جائے۔

مولانا وحید الدین خان لکھتے ہیں:

"مذہب کا جذبہ انسان کا فطری جذبہ ہے، کسی طرح اس کو انسان سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ جدید دور میں آخری کوشش یہ کی گئی ہے کہ وحی سے آزاد ہو کر انسانی ساخت کا ایک "مذہب" بنایا جائے اور اس کو انسان کی مذہبی تلاش کے جواب کے طور پر پیش کیا جائے۔ مگر اب تک کی کوشش نے صرف یہ بتایا ہے کہ جس کائنات میں انسان کلی علم تک پہنچنے سے عاجز ہے۔ اس کائنات میں بسنے والی مخلوق کے لیے وہ ایسا دین بھی واضح نہیں کر سکتا جو خالق کائنات سے کلی مطابقت رکھنے والا ہو۔"(۴۶)

دنیا کے تمام مذہب نے اخلاقیات اور انسانوں کے مابین معاملات پر رہنمائی دی ہے۔ اس حوالے سے کوئی بھی مذاہب کی اہمیت سے انکار نہیں کر سکتا تمام ادیان میں سب سے غالب دین اسلام ہے۔ یہ تمام مذہب پر فوقیت رکھتا ہے۔ انسانیت کے لیے رہنما بن کر آیا ہے اس مذہب کے اندر قیامت تک آنے والے انسانوں کے لیے رہنمائی میسر ہے۔

جدید معاشرے کے اندر افراد کی تذلیل کی سب سے بڑی وجہ مذہب سے دوری ہے۔ مسلمانوں کے علاوہ دیگر مذاہب کے لوگ بھی بے عملی کے راستے پر ہیں۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ مذہب کی تعلیمات صرف چند رسموں تک محدود ہو کر رہ گئی ہیں۔ اس سے معاشرے کے افراد بے راہ روی کا شکار ہو گئے ہیں۔ امن و سکون کی زندگی بے سکونی میں بدل گئی ہے۔ اس بے عملی کی وجہ سے نسلیں تباہی کا شکار ہو رہی ہیں۔ خاص کر دیکھا گیا ہے کہ جدید معاشرے کے اندر بہت سارے وہ لوگ جو مذہبی طور پر ہمارے رہنما ہیں یا انھوں نے مذہبی لبادہ اوڑھ رکھا ہے اور مذہبی تعلیمات کے فرائض انجام دے رہے ہیں ایسے زیادہ تر افراد مذہبی لبادے کے باوجود بے عملی کا شکار ہیں۔ اس سے معاشرے کے بہت سارے وہ لوگ جو ان مذہبی لوگوں کو اپنا رہنما سمجھتے ہیں اور ان کی کہی ہوئی بات کو حرف آخر سمجھتے ہیں۔ خلیل اشرف الدین لکھتے ہیں:

"مذاہب آج کل بے گھر ہیں لیکن بے نیاز۔ اسے مہمان بننے کی خواہش نہ کبھی رہی ہے نہ اب ہے۔ اسے اس کی شرطوں پر کوئی مہمان بنا لے تو اسے انکار بھی نہیں۔ وہ فروکش بھی ہے اور پا بہ رکاب بھی۔ وہ اپنے بال و پر سمیٹے ہوئے بھی ہے اور پر تولے تیار بھی ہے۔"(۴۷)

جدید معاشرے میں بے عملی کی وجہ سے افراد ایسے مسائل کا شکار ہو گئے ہیں جن سے نکلنا ان کے لیے بہت مشکل ہو گیا ہے۔ شعیب خالق نے اپنے افسانے "چھتری نما کہانیاں" میں جہاں دیگر مسائل کی بات

کی وہاں انہوں نے جدید معاشرے کے اندر مذہب کو ڈھال بنا کر ایسے افراد کے چہرے بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے جو بذات خود مذہبی رہنما کے طور پر لوگوں کے سامنے خود کو پیش کرتے ہیں۔ لیکن در حقیقت وہی لوگ اندر سے کھوکھلے اور بے عمل ہوتے ہیں اور ان کی پیروی کرنے والے لوگ بھی ان کے راستے پر چلتے ہوئے بے عمل اور بے راہ روی کا شکار انجانے طور پر بنتے جارہے ہیں۔

جدید معاشرے کے اندر بعض مذہبی رہنما بے عمل ہوتے ہیں۔ تعلیمی شعور اور مذہبی تعلیم سے مکمل آشنا نہیں ہوتے۔ دوسرے لوگوں پر مذہب کے حوالے سے ہر قسم کی بے جا پابندیاں عائد کر دی جاتی ہیں۔ لیکن خود مذہب کے بتائے ہوئے کسی بھی ایک رخ پر عمل نہیں کرتے۔

> "مدرسے میں پڑھتا ہوں۔ مولی صاحب کے کمرے میں ڈش والا ٹی وی بھی ہے۔ وہ مجھے دیکھ رہی تھی نا؟ ہیں نا؟ تم رہتے بھی مدرسے میں ہو یا تمہارا کہیں گھر بھی ہے۔ ادھر ہیں وہ میرا سوال سن کر اپنی موجی کیفیت سے باہر نہ نکل سکا، "حوریں، حوریں، وہ کون تھی ؟ ہیں، مخاطب جیسے وہ مجھ سے مگر سوال خود سے کرتے ہوئے مسکرایا بڑبڑایا۔ میں نے اس کے سوال کا جواب دینا مناسب نہ سمجھا اور اسے اس کی عارضی تفریح میں گم چھوڑ دیا۔"(۴۸)

جدید معاشرے کے اندر سب سے بڑا مسئلہ مذہب کو ڈھال بنا کر دوسروں پر بے جا پابندیاں عائد کر دی جاتی ہیں لیکن بعض مذہبی رہنما بذات خود اوپر سے ہی صرف مذہب کی چادر اوڑھ لیتے ہیں اور اندر سے معاشرے کی تمام برائیاں پھیلانے کے بھی ذمہ دار ہوتے ہیں۔ بعض مذہبی رہنماؤں کی بے عملی کی وجہ سے معاشرہ بے راہ روی کا شکار ہوتا جارہا ہے۔ بعض مذہبی رہنما حوروں کا تصور بھی اس انداز سے پیش کرتے ہیں کہ آج کے جدید دور کے اندر دنیا میں جیتی جاگتی لڑکیاں بھی ان لڑکوں کو حوریں لگتی ہیں جس کی وجہ سے معاشرے کے اندر جنسی بے راہ روی جیسے مسائل بہت زیادہ بڑھ گئے ہیں۔

انسان اپنے حواس خمسہ کی مدد سے آج ترقی کی منازل طے کر رہے ہیں لیکن حواس خمسہ کی مدد سے حاصل کیا جانے والا علم اتنا پختہ نہیں ہے کہ وہ کائنات کی حقیقت کا مکمل حاطہ کر سکے۔

سید ابو الحسن علی ندوی رقمطراز ہیں: "جب اس زندگی کا ہم اپنے حواس کے ذریعے سرے سے ادراک ہی نہیں کر سکتے تو اس کی مزید تفصیلات و کیفیات کا علم کیا حاصل کر سکتے ہیں۔"(۴۶)

شعیب خالق کے فکشن میں سائنسی اثرات کی جھلک نظر آتی ہے۔ سائنس کی بدولت دنیا میں ہونے

والی تبدیلیوں پر غور وفکر کر کے شعیب خالق نے سائنسی ترقی کی بدولت مادی تبدیلیوں کی عکاسی کی ہے۔ جہاں سائنس نے انسان کو ترقی کی منزل دکھائی ہے وہاں بہت سے مسائل بھی پیدا کیے ہیں جس کی وجہ سے جدید دور کے اندر بھی بہت سے مسائل پیدا ہوئے ہیں۔

نرمل چندر لکھتے ہیں۔

> "سائنس نے دنیا میں اس قدر مادی تبدیلیاں پیدا کر دی ہیں کہ اب انسانی دنیا میں بہتر اور خوشتر دنیا کی نئی امیدیں پیدا ہو گئی ہیں۔ اب وہ سورگ میں جانے کی آشا رکھنے کی بجائے اسی زمین پر ہی سورگ تعمیر کرنے کی کوشش میں ہے۔ نیز سائنس نے انسان کو بیرونی سند کی غلامی سے آزاد کر دیا ہے وہ صرف مذہبی کتابوں کی سند کسی بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں۔ وہ اپنی اندرونی روشنی کو ہی آخری سند مانتا ہے اور مذہبی کتب کا بھی نکتہ چینی کے ساتھ مطالعہ کرنے کی جرات کرنے لگا ہے۔"(۴۹)

رشوت خوری:

افسانہ "ڈبل سواری میں شعیب خالق نے رشوت جیسی صورتحال کی عکاسی کی ہے جو جدید معاشرے کا اہم مسئلہ بن چکا ہے۔ رشوت بدعنوانی کی ایک قسم ہے جس میں پیسہ یا تحفہ دینے والے کا طرز عمل مختلف ہوتا ہے۔ کیونکہ رشوت دینے والا اپنے مفاد کو مد نظر رکھ کر تحفہ یا پیسے دیتا ہے۔ تحفہ یا پیسہ وصول کرنے والے کا طرز عمل بھی بہت حد تک تبدیل ہو جاتا ہے۔ ہمارے سماج کے اندر رشوت کو گناہ سمجھا جاتا ہے۔ رشوت سرکاری آفیسر یا کسی عوامی عمل کو متاثر کرنے کے لیے کسی چیز کی پیشکش کی جاتی ہے۔ کسی سے کچھ وصول کیا جاتا ہے یا اپنی من پسند کوئی چیز مانگی جاتی ہے۔ یہ سب رشوت کے زمرے میں آتی ہے۔

رشوت کا مقصد لینے والے کے عمل کو اثر انداز کرنا ہوتا ہے۔ رشوت، پیسہ، چیز، ترجیح، معاوضہ اور جائیداد وغیرہ کی شکل میں دی جاتی ہے۔ رشوت ناجائز ذرائع آمدنی حاصل کرنے کا ایک نام ہے۔ رشوت کی وجہ سے کسی بھی فرد کو سرکاری یا غیر سرکاری ادارے کو نقصان پہنچانے کا باعث بنتی ہے۔

جدید معاشرے کے اندر رشوت ایک لاعلاج مرض کی طرح دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ جس کا کوئی بھی حل ابھی نظر نہیں آرہا۔ رشوت کی زد میں عام آدمی سے لے کر پڑھے لکھے آدمی تک زیادہ تر افراد اس بیماری میں مبتلا ہیں۔ جدید معاشرے کے اندر رشوت کی ایک بڑی وجہ لوگوں کی بے حسی ہے۔ لوگ ایک دوسرے کا چھوٹا بڑا کام بھی رشوت کے بغیر نہیں کرتے۔ جیلوں کے حوالوں سے دیکھا جائے تو جیلوں کے اندر

لوگ اپنے عزیزوں کو ملنے کے لیے پولیس اہلکاروں کو رشوت دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ قبرستانوں کو بھی رشوت نے نہیں چھوڑا۔ قبرستانوں کے اندر لوگ قبر حاصل کرنے کے لیے رشوت کے ذریعے لین دین کے معاملات طے کرتے نظر آتے ہیں۔

اس سے بڑا ظلم اس جدید معاشرہ کے اندر کیا ہوگا کہ جدید معاشرے کے اندر لوگ ملازمتوں کے حصول کے لے رشوت کا سہارا لیتے ہیں۔ جدید معاشرے کے اندر ملازمتوں کا حصول رشوت کے بغیر ناممکن ہے۔ اس دور کے اندر لوگوں کے دلوں میں اللہ کا خوف ختم ہوتا جا رہا ہے۔ بے حسی کی بدولت لوگ صرف اپنے ذاتی مفاد کو مد نظر رکھ کر دوسرے لوگوں کے کام آتے ہیں۔ جہاں کسی کو کوئی فائدہ نہیں ہو رہا ہوتا تو وہاں کوئی بھی کام نہیں کرتا۔ ہر کوئی یہ دیکھتا ہے کہ پیسہ ان کو کہاں تک لے کر جائے گا۔

خالد سہیل رقمطراز ہیں:

"انسانی بچے اپنی جبلتوں کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں اور اپنی خواہشات کی فوری تسکین چاہتے ہیں۔ انسانی معاشرہ ان پر کچھ پابندیاں عائد کرتا ہے تاکہ انسانی زندگی اور معاشرے میں ایک ہمدردی اور توازن قائم ہو سکے۔ بعض انسانوں کے لیے ان پابندیوں کو قبول کرنا آسان ہوتا ہے اور بعض کے لیے بہت مشکل۔ بعض انسان تو پابندیوں اور قربانیوں کی وجہ سے نفسیاتی مسائل کا شکار ہو جاتے ہیں۔ وہ ان جبلتوں پر جو انہوں نے حیوانی آباؤاجداد سے وارثت میں پائی ہیں قابو نہیں پا سکتے۔"[۵۰]

جدید معاشرے کے اندر انسان کی اہمیت کم اور پیسے کی اہمیت بہت زیادہ ہوگئی ہے جس کی وجہ سے دن بدن رشوت جیسی برائی میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملک کے اندر کرپشن بڑھتی جا رہی ہے اور کوئی پوچھنے والا بھی نہیں ہے۔ رشوت میں دن بدن اضافہ کا باعث بننے والی ہماری طرز زندگی بھی ہے۔ ہر کوئی چاہتا ہے کہ اس کے پاس بڑا گھر ہو، گاڑی ہو، ایر کنڈیشنز گھر ہو، نوکر چاکر ہوں۔ یہ لا محدود خواہشیں محدود آمدنی سے ممکن نہیں ہیں۔ اسی وجہ سے لوگ رشوت کا سہارا لے کر ناجائز ذرائع سے آمدنی حاصل کرنے کی دوڑ میں چل نکلے ہیں۔ اس کے علاوہ رشوت میں اضافہ کا باعث غربت، بے روزگاری اور بڑھتی ہوئی مہنگائی بھی ہے۔ ان مسائل سے دوچار لوگ بھی ناجائز ذرائع سے آمدنی حاصل کرنے کی دوڑ میں ہیں۔

رشوت کی وجہ سے جدید معاشرے کے معاشرتی مسائل بڑھتے جا رہے ہیں۔ جدید دور کے اندر ہر شعبہ زندگی میں رشوت، سفارش اور لوٹ مار نظر آ رہی ہے۔ لیکن رشوت کی وجہ سے دوسرے لوگوں کی

حق تلفی ہوتی ہے۔ حقوق العباد کی نفی کر کے حقوق اللہ کے معاملوں کو بھی فراموش کیا جا رہا ہے اس وجہ سے حالات دن بدن بدتر ہوتے جا رہے ہیں۔

جدید معاشرے کے اندر رشوت کی روایت پروان چڑھتی جا رہی ہے۔ رشوت کے بل بوتے پر لوگ جھوٹی شہادتوں کا سہارا لے کر حالات وواقعات کو تبدیل کر دیتے ہیں۔ لیکن بے حسی کی وجہ سے ان لوگوں کو احساس تک نہیں ہوتا۔ دوسروں کا حق تلف کر کے اپنے مفاد کو ترجیح دیتے ہیں۔ انصاف کے خلاف فیصلے سنا کر اپنے آپ کو اونچا سمجھنے والے رشوت کے انتہاہی درجے تک پہنچنے والے لوگ ہیں۔ اپنے مفاد کی خاطر اپنے ضمیر اور ایمان کو بھی بیچ ڈالتے ہیں جس کے وجہ سے وہ ضمیر اور ایمانداری کی دولت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ ان کے اندر غیروں کے مقابلے میں قوت اور توانائی بھی ختم ہو جاتی ہے۔ حاکم اپنے محکوم سے کسی نہ کسی صورت میں رشوت وصول کر لیتا ہے اور اس کو اپنا فرض مذہبی سمجھتا ہے۔

جدید معاشرے کے اندر رشوت کی وبا اتنی عام ہو چکی ہے کہ ہر حاکم وکارکن خوف میں مبتلا ہے۔ پورا نظام حکومت بھی رشوت کی وجہ سے بدحالی وبے اعتمادی اور لاقانونیت کا شکار نظر آتا ہے۔ قوم بھی بے اطمینانی اور مصائب وپریشانیوں میں گھیری ہوئی ہے۔

جدید معاشرے کے اندر رشوت کے نظام نے پوری طرح اپنے پنجے گاڑ دیئے ہیں۔ جدید معاشرے کے اندر ہر فرد نہ چاہتے ہوئے بھی اس نظام کو قبول کر چکا ہے۔ ہمارا طرز زندگی بھی بدل گیا ہے۔ آج کے جدید دور کے اندر ہر فرد اپنے جائز اور ناجائز کام نکلوانے کے لیے رشوت کا سہارا لیتا ہے۔ جس کی وجہ سے ملکی معیشت کھوکھلی ہو کر رہ گئی ہے اور عوام بھی عدم تحفظ کے احساس کا شکار ہے۔ اسی سماجی برائی میں سرکاری مشینری کے ساتھ ساتھ عام آدمی بھی برابر کا مجرم ہے۔

شعیب خالق نے اپنا افسانہ "ڈبل سواری" کے اندر رشوت جیسے بڑھتے ہوئے اہم مسائل کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کروائی ہے۔ کہ آج کے جدید معاشرے کے اندر فرائض مذہبی کی ادائیگی میں رشوت لینے سے گریز نہیں کیا جاتا ہے۔ جدید دور کے اندر حاکم اپنے محکوم سے رشوت لینے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتا۔ اس کو بھی اپنی ضرورت سمجھ کر رشوت لینے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا۔ حالانکہ رشوت کے ساتھ ناجائز مفاد وابستہ ہوتے ہیں۔ لیکن ہر کوئی اپنے مفاد کو مد نظر رکھ کر رشوت کا تقاضا کرتا ہے۔ اسی کی عکاسی شعیب خالق نے اپنا افسانہ "ڈبل سواری" میں اس طرح کی ہے:

"باؤ یار پچاس والا قائد اعظم لگاؤ اور جاؤ۔ میں نے بھی کمال سہولت سے مسکراتے

ہوئے جواب دیا۔ میرے پاس صرف ایک یہی نوٹ ہے جو میں نہیں دے سکتا۔ میرا چٹاجواب سن کر اس کی آنکھوں کی بے حیائی چہرے کے مسکراتے تاثر میں جھانکی اور وہ موٹر سائیکل کی چابی انگلی میں گھماتے ہوئے بولا۔ پھر تو بڑا مسئلہ بن جائے گا۔ سُکا سُکا چھوڑنا، کس طرح حل کریں۔ یہ مسئلہ باؤ یار ہیں۔"(۵۱)

جدید معاشرے کے اندر لوگ صرف اپنے ذاتی مفاد کو مد نظر رکھتے ہیں دوسرا کس حالت میں ہے کسی کو کوئی پرواہ نہیں ہے۔ جس طرح اس افسانے کا مرکزی کردار واحد متکلم کے پاس صرف ایک پچاس کا نوٹ ہوتا ہے لیکن رشوت مانگنے والے اہلکار کو صرف اپنے پیسوں سے مطلب ہوتا ہے۔ اس کو کوئی پرواہ نہیں کہ یہ کون ہے، کہاں سے کما کر لایا ہے، اس نوٹ کو اس نے کہاں کام میں لانا ہے۔ رشوت لینے والے اہلکار کو جب رشوت نہیں دی جاتی تو وہ دوسرے گروہوں کے لیے ایک بڑا مسئلہ بنا دیتے ہیں۔

رشوت جیسے مرض میں دن بدن اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ بے حسی کی وجہ سے لوگ صرف اپنے ذاتی مفاد کو ترجیح دیتے ہیں۔ نچلے طبقے سے لے کر اعلی طبقے تک ہر کوئی اس مرض میں مبتلا ہے۔ ہر جگہ جائیداد، پیسہ وغیرہ کسی نہ کسی صورت میں رشوت کے گرد گھوم رہا ہے۔ اسی کی عکاسی شعیب خالق نے اپنے افسانے کے اندر کی ہے کہ جدید معاشرے کے اندر یہ مرض اس حد تک بڑھ چکا ہے کہ اب اس پر قابو پانا ناممکن ہو چکا ہے۔ جدید معاشرے کا زیادہ تر مہذب سے مہذب طبقہ یا ادارہ رشوت کے مرض میں گھیرا ہوا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ابو الاعجاز صدیقی (مرتب)، کشاف تنقیدی اصطلاحات، طبع دوم، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۸ء، ص ۹۳

۲۔ ایضا، ص ۹۳

۳۔ انور جمال، پروفیسر، ادبی اصطلاحات، نیشنل بک فاونڈیشن اسلام آباد، ۲۰۱۲ء، ص ۹۳

۴۔ شعیب خالق، آنٹی، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۰۱ء، ص ۳۳

۵۔ شعیب خالق سے راقم کا انٹرویو، بمقام کشمیر روڈ، صدر، راولپنڈی، بتاریخ ۲۶ جون ۲۰۱۹ء

۶۔ نوشیلہ انجم، شعیب خالق کے افسانے بے حرف لفظ اور ناولٹ آنٹی کا فنی اور فکری جائزہ، ص ۱۳

۷۔ شعیب خالق، آنٹی، ص ۱۱۹

۸۔ شعیب خالق، ایک نوکر کی کہانی، مشمولہ، چھتری نما کہانیاں، ص ۶۲

۹۔ ایضا، ص ۶۷

۱۰۔ شعیب خالق، بسکٹ، مشمولہ، چھتری نما کہانیاں، ص ۴۷

۱۱۔ ایضا، ص ۷۱

۱۲۔ شعیب خالق، لاٹو، مشمولہ، چھتری نما کہانیاں، ص ۱۹

۱۳۔ نجیبہ عارف، ڈاکٹر سے راقم کا انٹرویو، بمقام البیرونی بلاک، بین الاقوامی اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد، بتاریخ ۴ مارچ ۲۰۲۰ء

۱۴۔ شعیب خالق، لاٹو، مشمولہ، چھتری نما کہانیاں، ص ۱۹

۱۵۔ شعیب خالق، چالیس روپے، مشمولہ، چھتری نما کہانیاں، ص ۵۳

۱۶۔ شعیب خالق، بسکٹ، مشمولہ، چھتری نما کہانیاں، ص ۶۹

۱۷۔ شعیب خالق، اپنا گھر، مشمولہ، چھتری نما کہانیاں، ص ۱۱۲

۱۸۔ شعیب خالق، بے حرف لفظ، مشمولہ، چھتری نما کہانیاں، ص ۷۴

۱۹۔ شعیب خالق، چالیس روپے، مشمولہ، چھتری نما کہانیاں، ص ۵۴

۲۰۔ شعیب خالق، ایک نوکر کی کہانی، مشمولہ، چھتری نما کہانیاں، ص ۶۳

۲۱۔ شعیب خالق، ایک روپیہ روزانہ، مشمولہ، چھتری نما کہانیاں، ص ۱۳۸

۲۲۔ شعیب خالق، چالیس روپے، مشمولہ، چھتری نما کہانیاں، ص ۵۳

۲۳۔ شعیب خالق، اپنا گھر، مشمولہ، چھتری نما کہانیاں، ص ۱۱۴

۲۴۔ شعیب خالق، مندرجہ ذیل، مشمولہ، چھتری نما کہانیاں، ص ۷۴

۲۵۔ عبد السلام، پروفیسر،ڈاکٹر، عبد الحق حسرت، عصمت چغتائی اور نفسیاتی مسائل، اعجاز پبلشنگ ہاوس، دہلی،۱۹۸۹ء، ص ۴۴

۲۶۔ تنویر احمد، مفتیانے اور عورت، مشمولہ، ادب کی نسائی رد تشکیل از فہمیدہ ریاض، وعدہ کتاب گھر، کراچی،۲۰۰۶ء، ص ۹۵

۲۷۔ شعیب خالق، آنٹی، ص ۶۷

۲۸۔ ممتاز مفتی (افسانہ ڈائری) فیروز سنز، لاہور،۱۹۹۸ء، ص ۱۲۳

۲۹۔ تنویر انجم، عصمت چغتائی کا نسائی شعور، مشمولہ، فیمنزم اور ہم ادب کی گواہی، از فاطمہ حسن، وعدہ کتاب گھر، کراچی،۲۰۰۵ء، ص ۱۲۰

۳۰۔ شعیب خالق، آنٹی، ص ۶۴

۳۱۔ محمد اسلم فاروقی، ڈاکٹر، سائنس نامہ اردو میں سائنسی مضامین کا مجموعہ، امان پبلیشرز، حیدر آباد،۲۰۱۴ء، ص ۴۲

۳۲۔ شعیب خالق، رائل سیلیوٹ، مشمولہ، چھتری نما کہانیاں، ص ۹۹

۳۳۔ شعیب خالق، بس ایک سگریٹ، مشمولہ، چھتری نما کہانیاں، ص ۱۴۸

۳۴۔ ایضا، ص ۱۵۵

۳۵۔ بادشاہ منیر بخاری، اردو ادب میں عورت کا تصور مرد کی نظر میں، مشمولہ، ادب کی نسائی رد تشکیل، از فہمیدہ ریاض، وعدہ کتاب گھر، کراچی،۲۰۰۶ء، ص ۱۴۲

۳۶۔ شعیب خالق، پاؤں کی جوتی، مشمولہ، چھتری نما کہانیاں، ص ۱۲۸

۳۷۔ ایضا، ص ۱۲۹

۳۸۔ عصمت جمیل، ڈاکٹر، نسائی شعور کی تاریخ اردو افسانہ اور عورت، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان،۲۰۱۹ء، ص ۶۸

۳۹۔ شعیب خالق، بس ایک سگریٹ، مشمولہ، چھتری نما کہانیاں، ص ۵۲

۴۰۔ ایم سلطانہ بخش، ڈاکٹر، پاکستانی ادبیات میں خواتین کا کردار، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد،۱۹۹۶ء، ص ۴۵۳

۴۱۔ ایضا، ص ۴۵۳

۴۲۔ شعیب خالق، آنٹی، ص ۱۰۶

۴۳۔ دیش بھگت لالہ ہر دیال، مذہب اور انسانیت، میسرز لاجپت رائے اینڈ سنز پبلیشرز، لاہور،۱۹۳۸ء، ص ۲۷۴

۴۴۔ مرتضی علی اطہر، ڈاکٹر، فہیمدہ ریاض کی شاعری میں جدید عورت، کتابی دنیا، دہلی،۲۰۰۹ء، ص ۱۳

۴۵۔ احسان اللہ خان، ڈاکٹر، مذہب اور سائنس، بیت الحکمت سیکٹر، دہلی، ۱۹۸۱ء، ص۸
۴۶۔ وحید الدین خان، مولانا، مذہب اور سائنس، نظام الدین ویسٹ مارکیٹ، نئی دہلی، ۱۹۸۰ء، ص۷
۴۷۔ خلیل شرف الدین، مذہب کی حقیقت، لاہوتی فائن آرٹ، دہلی، ۱۹۸۰ء، ص۲۳
۴۸۔ شعیب خالق، چھتری نما کہانیاں، مشمولہ، چھتری نما کہانیاں، ص۱۰۹
۴۹۔ ابوالحسن علی ندور، سید، مذہب وتمدن، مکتبہ جامعہ، دہلی، ۱۹۴۳ء، ص۹
۵۰۔ نرم چندر، مذہب اور سائنس (دیرم اور گیان)، ستیہ گیاں، پبلشنگ سوسائٹی اوکاڑہ، س ن، ص۱۲
۵۱۔ خالد سہیل، مذہب سائنس اور نفسیات، موڈرن پبلیشنگ ہاؤس، دریا گنج، ۱۹۹۸ء، ص۲۶
۵۲۔ شعیب خالق، ڈبل سواری، مشمولہ چھتری نما کہانیاں، ص۱۲۱

باب چہارم:

مجموعی جائزہ:

شعیب خالق جدید دور کے نمائندہ فکشن نگاروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا باقاعدہ آغاز ۱۹۹۰ء میں کیا۔ جب ان کا پہلا افسانوی مجموعہ "بے حرف لفظ" کے نام سے شائع ہو کر سامنے آیا۔ لکھنے لکھانے کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ مگر گھریلو حالات کی خرابی اور ذمہ داریاں اس قدر زیادہ تھیں کہ دبی ہوئی خواہشات احاطہ تحریر میں نہ لا سکے۔ لیکن چھٹی جماعت سے ہی سکول میں مختلف سرگرمیوں میں حصّہ لینے کا شوق تھا۔ شاعری، لطیفے، اقوال زریں اور مختلف کرداروں کی نکلیں اتارنا بھی ان کا مشغلہ رہا ہے۔ کالج کے زمانے میں شعیب خالق شاعری کی طرف مائل ہوئے لیکن جلد ہی اپنے دوست مسعود صاحب کے کہنے پر نثر کی طرف مائل ہو گئے۔ شعیب خالق نے اپنا انشائیہ "آوارہ گردی" کے نام سے لکھا ہے۔ انشائیہ لکھنے کے بعد افسانے کی جانب راغب ہو گئے۔ جب پہلا افسانوی مجموعہ "بے حرف لفظ" لکھا تو اس میں بہت ساری کہانیوں کو کانٹ چھانٹ کر کے شائع کروایا۔ اس کے بعد شعیب خالق ادبی حلقوں میں افسانہ نگار کے نام سے پہچانے جانے لگے۔ ایک افسانوی مجموعے کی اشاعت کے بعد ان کا ذہن مزید لکھنے کی جانب مائل ہوا۔ شعیب خالق کی دوسری کتاب "آنٹی" جو ناولٹ ہے ۲۰۰۱ء میں شائع ہوا۔ ناولٹ کے شائع ہونے کے بعد ادبی سفر میں اور ادبی حلقوں میں بے پناہ کامیابی اور پذیرائی ملی۔ شعیب خالق کا تعلق شکرپڑیاں سے ہے۔ پنجاب کی ستر فیصد آبادی گاؤں سے منسلک ہے۔ ان کے آباؤ اجداد کا تعلق آزاد کشمیر کے ایک گاؤں "ٹائیں" کی ایک فقیر فیملی سے ہے۔ کشمیر کے گاؤں "ٹائیں" سے آنے والے آباؤاجداد یہاں راولپنڈی میں آباد ہو گئے۔ شعیب خالق کی والدہ محترمہ کا تعلق "گکھڑ" خاندان سے ہے۔ شعیب خالق کے نانا عنایت اللہ جان کیانی نے انڈین نیشنل آرمی میں کمیشن لیا اور بعد میں پاکستان آرمی سے کرنل کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے۔ راجہ عبدالخالق شعیب خالق کے والد تھے ان کا معروف نام راجہ کالا خان تھا اور زیادہ تر لوگ ان کو اس ہی نام سے پکارتے تھے۔ انھوں نے صرف میٹرک تک تعلیم حاصل کی تھی وہ ہاکی کے بہت اچھے کھلاڑی تھے۔

پاکستان نیوی میں بطور کھلاڑی ان کو شامل کیا گیا تھا۔ شعیب خالق کا تعلق دو خاندانوں سے تھا ایک ان کی والدہ کا خاندان جو "گکھڑ" خاندان تھا اور ایک ان کے والد کا خاندان جو آزاد کشمیر کے "فقیر" سے تعلق رکھتا تھا۔ ان دو مختلف خاندانوں نے شعیب خالق کی شخصیت پر براہ راست اثرات مرتب کیے۔ کیونکہ یہ دو مختلف گھرانے چکی کے دو مختلف پاٹ تھے جن میں دکھوں، محرومیوں، تفاخر و غرور کی پسپائی کے سارے گھن ان کے اندر پستے

رہے۔ دو مختلف خاندانوں میں آنکھ کھولنے کی وجہ سے دو مختلف تجربوں کا، دو دنیاؤں کا، دو مختلف طبقات کو سمجھنے کا موقع ملا۔ اس وجہ سے ان کی تحریروں کے اندر بھی یہ اثرات براہ راست دکھائی دیتے ہیں۔ شعیب خالق نے اپنی عملی زندگی کا آغاز پڑھائی چھوڑ کر "ایکس رے ویلڈر" کا ڈپلومہ لینے کے بعد شروع کیا تھا۔ وہ سات ماہ کورنگی کراچی گئے۔ اس کے بعد وہاں سے اردن روانہ ہو گئے اور وہاں کچھ عرصہ گزارا۔ ۱۹۷۸ء میں یورپ میں رہنے کا پروگرام دو دوستوں کے ساتھ مل کر بنایا اور آسٹریا کا ویزہ لیا اور وہاں پہنچے۔ وہاں سے جرمنی جانے کا پروگرام بنایا۔ غیر قانونی طور پر بارڈر کراس کرتے ہوئے پکڑے گئے۔ پکڑے جانے کی وجہ سے جرمانے کے ساتھ پندرہ دنوں میں آسٹریا سے بھی نکل جانے کا حکم سنایا گیا۔ واپسی پر ناکام منہ لے جانے کے ڈر سے شعیب خالق ایران میں ٹھہر گئے اور دوست واپس پاکستان چلے گئے۔ یہ وہ وقت تھا جب ایران میں عروج کا زمانہ تھا۔ خمینی کی آمد سے چند دن قبل وہاں سے نکلے اور افغانستان کی طرف وہاں سے روانہ ہو گئے۔ کچھ عرصہ کابل بھی رہے۔ یوں عملی زندگی میں پے در پے ناکامیوں نے کہیں بھی پاؤں نہ جمنے دیے اور واپس پاکستان آ گئے۔ پاکستان آ کر بھی ذریعہ روزگار حاصل نہ کر سکے۔ ۱۹۸۳ء میں شعیب خالق کی والدہ گردوں کی ناکارگی کے باعث ہسپتال جا پہنچی اور موت کے منہ میں چلی گئیں۔ اس طرح بہن بھائیوں کی سرپرستی شعیب خالق کے سر آ پہنچی تو شعیب خالق نے دو نوکریاں کرنا شروع کر دیں تاکہ گھریلو اخراجات کو چلایا جا سکے۔ سرکاری نوکری ٹورازم بھی حاصل کی۔ ۱۹۸۵ء تک ملازمت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ پے در پے ناکامیوں اور بے روزگاری نے شعیب خالق کی شخصیت پر گہرے اثرات مرتب کیے اور یہی اثرات اردو ادب میں افسانہ نگاری کے اندر براہ راست دیکھے جا سکتے ہیں۔ شعیب خالق اردو ادب میں افسانہ نگاری کی حیثیت سے پہچانے جانے جاتے ہیں اور موجودہ دور میں افسانہ نگاروں میں ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ ادبی زندگی کی ابتداء تو شعیب خالق کی بہت آ گئے چل کر ہوئی البتہ سکول کے زمانے میں بچپن ہی سے کسی نہ کسی طرح ادب سے منسلک رہے۔ سکول کے اندر مختلف ڈرامے بنائے اور خود بھی ان میں مرکزی کردار ادا کرنے میں سرگرم رہتے تھے۔ شاعری، لطیفے، اقوال زریں، مختلف کرداروں کی نقلیں اتارنا وغیرہ یوں وہ بزم ادب کا روح رواں رہتے تھے۔ شاعری کی طرف شعیب خالق کالج کے زمانے میں مائل ہوئے لیکن ایک دوست شاہد مسعود کے کہنے پر شاعری چھوڑ کر نثر کی جانب توجہ مبذول کی۔ انشائیہ "آوارہ گردی" کے نام سے شعیب خالق نے انشائیہ لکھا اور اس کے بعد افسانے کی جانب راغب ہو گئے۔ ۱۹۸۰ء میں اپنی تحریروں کو جمع کیا لیکن وہ تحریریں کبھی شائع نہ ہو سکیں۔ "لفظ لوگ" نامی کتاب لکھ ڈالی جس میں لوگوں سے ملاقات، کسی لفظ دیس

کے الفاظ اور ایک لفظ کے ساتھ اس کے ماضی، حال اور مستقبل کے حوالے سے بہت سے سوالات کو اکھٹا کیا۔ یہ لطیف عباسی کی سربراہی میں ہر روز ایک لفظ کے ساتھ کسی مضمون پر مبنی تحریر لکھتے اور اس کو اکھٹا کرتے جاتے۔ شعیب خالق اس طرح نثر کی جانب مائل ہو گئے اور باقاعدہ افسانے کی جانب اپنی توجہ مبذول کر دی۔ شعیب خالق کی پہلی کتاب "بے حرف لفظ" سامنے آئی جو جدید افسانوں پر مبنی کتاب تھی۔ ۱۹۹۰ء میں دانیال پبلیشرز کراچی سے شائع ہوئی۔ اس کتاب میں موضوعاتی تنوع پایا جاتا ہے لیکن اس کا ایک خاص موضوع جدید معاشرے کے فرد کے داخلی اور خارجی مسائل بھی ہیں جن کو شعیب خالق نے قارئین کے سامنے لانے کی کوشش کی ہے کہ یہ وہ مسائل ہیں جس میں آج کا جدید معاشرہ گھیرا ہوا ہے۔ شعیب خالق کی دوسری کتاب ناولٹ "آنٹی" ہے جس کو مختصر ناول یا طویل افسانہ کہا جا سکتا ہے۔ یہ کتاب دوست پبلیشرز اسلام آباد سے شائع ہوئی۔ اس کتاب میں بھی موضوعاتی تنوع پایا جاتا ہے تاہم اس کتاب کا موضوع فرد کے داخلی اور خارجی مسائل سے ہے جو ہمارے آج کے جدید معاشرے کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ داخلی اور خارجی مسائل سے گھیرا ہوا انسان نفسیاتی مسائل میں خود بخود مبتلا ہو جاتا ہے جس میں جنس، عمر اور اپنی خواہشات کو بھی تابع نہیں رکھ سکتا۔ جس کی وجہ سے بہت سے مسائل بھی پیدا ہو رہے ہیں۔ اس کی عکاسی شعیب خالق نے اپنے ناولٹ "آنٹی" میں بھی کی ہے۔ فرد کے داخلی اور خارجی مسائل کو مدنظر رکھتے ہوئے شعیب خالق نے اس کی عمدہ عکاسی کی ہے۔ شعیب خالق کا دوسرا افسانوی مجموعی "چھتری نما کہانیاں" کے نام سے طویل عرصہ بعد شائع ہوا ہے۔ اس میں بھی موضوعاتی تنوع پایا جاتا ہے۔ تاہم اس کا ایک اہم موضوع جدید معاشرے کے فرد کے داخلی اور خارجی مسائل بھی ہیں۔ انسان کی حقیقت، کائنات کی حقیقت، خوف، مایوسی، ناامیدی، انسانی اعضاء کی سمگلنگ، غریب طبقے کے مسائل، چھوٹے پیشوں سے حقارت کا رویہ، تعلیم سے دوری، جنسی بے راہ روی، منشیات کا استعمال وغیرہ ایسے داخلی اور خارجی مسائل ہیں جو جدید معاشرے کے اندر غالب آ چکے ہیں۔ شعیب خالق نے اپنے فکشن میں ان مسائل کی جانب توجہ مبذول کروانے کی کوشش کی ہے جو معاشرے میں جڑ کی حیثیت بن گئے ہیں۔ اس کے علاوہ خواتین کا استحصال، مذہب کی ڈھال اور بے عملی، رشوت اور کرپشن وہ مسائل ہیں جو آج کے جدید معاشرے کے اندر بڑھ چکے ہیں۔ ان پر قابو پانا آسان نہیں ہے لیکن ان مسائل میں جدید معاشرے کا فرد ان کی زد میں آئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جدید معاشرے کے اندر ان مسائل کے بڑھتے ہوئے عوامل اور اسباب کی جانب شعیب خالق نے توجہ مبذول کروا ہی ہے کہ جدید معاشرے کا فرد چاہے وہ عمر کے کسی بھی حصّے سے تعلق رکھتا ہو ان مسائل سے بچ نہیں پا رہا۔ یہ مسائل فرد کے داخل اور خارج

پر براہ راست اثرات مرتب کر رہے ہیں جن کی جانب شعیب خالق نے توجہ مبذول کروائی ہے۔ شعیب خالق نے اپنی تحریروں میں پڑھے لکھے ملازمین، غربت، بے روزگاری، بے بسی، رشوت، کرپشن غرض معاشرے کے افراد کے داخلی اور خارجی مسائل کو اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔ اپنے افسانوں کے اندر موضوعات کی بجائے حقیقت نگاری کو اپنایا۔ اپنے کرداروں کے ذریعے حقیقی زندگی کی کہانیوں کی عکاسی کی۔ اپنی زبان وبیان جو ان کی زندگی کا خاصہ ہے کہانیوں کے اندر زبان وبیان کو اس انداز سے احاطہ تحریر میں لایا ہے کہ کہانی پڑھتے وقت قاری کو یہ احساس ہوتا ہے کہ جیسے تمام تر حالات قاری اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والا یہ مرد لوگوں کا ہمدرد ہے۔ لوگوں کے دکھوں کا مداوا کہانیاں لکھ کر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

شعیب خالق کے دو افسانوی مجموعے اور ایک ناولٹ کے بیشتر کردار خارجی اور داخلی مسائل سے دوچار نظر آتے ہیں۔ چاہے وہ فرد کے کردار ہوں یا عورت کے کردار۔ ان کے ہاں سماجی کردار کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔ ان کے موضوعات میں طبقاتی نظام، دیہاتی طرز، معاشی پسماندگی، غربت، چائلڈ لیبر، رشوت، جنسی بے راہ روی، انسانی اعضاء کی سمگلنگ، چھوٹے پیشوں سے حقارت کا رویہ، خواتین کا استحصال، تعلیمی پسماندگی، ذہنی کشمکش، خوف وغیرہ جیسے مسائل کو واضح دیکھا جاسکتا ہے۔

شعیب خالق کے زیادہ تر افسانے جدید معاشرے کے فرد کے داخلی اور خارجی مسائل کے حوالے سے ہیں۔ برصغیر پاک وہند میں یہ نظام یورپ کی وجہ سے آیا۔ یورپین تو اس ملک کو چھوڑ کر خود چلے گئے۔ لیکن اپنے نظام کو یہیں چھوڑ کر چلے گئے۔ ملکی جڑوں کو کھوکھلا کرنے والے اس نظام نے جدید معاشرے میں جہاں افراد کی زندگی میں مثبت کردار ادا کیا وہاں منفی اثرات کو بھی زندگی میں مرتب کیا۔

شعیب خالق نے اپنے افسانوں میں اس نظام کی خرابیوں کو بیان کیا ہے۔ انھوں نے اپنے فکشن کے موضوعات کے ذریعے جدید معاشرے کے حوالے سے جو کچھ کہا اور جس انداز سے لکھا کہانی کار ہونے کے ناطے یہ ان کے جرات مند ہونے کی واضح مثال ہے۔ اپنے فکشن کی کہانیوں کے ذریعے جاگیردار کا استحصال بھی پیش کرتے ہیں۔ جبر واستبداد کی چکی میں پسنے والے غربا کی حالت زار کو بڑے ہمدردانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ اگرچہ ان کے افسانوں کے موضوعات جدید معاشرے کے فرد کے داخلی اور خارجی مسائل کے حوالے سے ہیں۔ لیکن ہر کہانی کے اندر ایک نئے موضوع کو اجاگر کیا ہے۔ کسی بھی پہلو کو تشنہ نہیں رہنے دیتے۔ جدید معاشرے کے مسائل کے ساتھ ساتھ اپنے ناولٹ "آنٹی" میں جنسیت کو بھی موضوع بنایا ہے اور جنسیت سے

جڑے عورت کی بے بسی اور مایوسی کو بھی اُجاگر کیا ہے۔شعیب خالق کی عورت غریب ، مظلوم ہونے کے باوجود بھی جرات مند اور بہادر دکھائی دیتی ہے۔اپنے افسانوی مجموعے" چھتری نما کہانیاں" کے اندر ایسی عورت کو موضوع بنایا ہے۔چاہے وہ حویلی کی ملکانی ہو،نوکرانی یا ملازمہ ہو،چاہے پڑھی لکھی ہوئی عورت ہو۔شعیب خالق عورت کی نفسیات کا گہرا مطالعہ کر کے اپنی تحریروں کی زینت بناتے ہیں۔شعیب خالق کی عورت ظلم وجبر کی چکی میں پستی نظر آتی ہے۔جبر کے نتیجے میں حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے نظر بھی آتی ہے۔لیکن مسائل سے دوچار اکثر ان کے کردار ہار جاتے ہیں۔

خاص ثقافتی مزاج اور ایک سماجی حقیقت نگار کی بناء پر ان کے افسانوں کے کردار اور موضوعات حقیقت کا روپ دھار لیتے ہیں۔انھوں نے قدیم معاشرے کے دکھ کو کہانی کی صورت میں بیان کیا ہے اور آج اکیسویں صدی میں بھی افراد بہت سے دکھوں کو جھیل رہے ہیں۔شعیب خالق چونکہ مرد افسانہ نگار ہیں اس لیے ان کے ہاں مردوں کے ایسے کردار پیش کرنے کا رحجان غالب ہے جو جدید معاشرے کی بالادستی اور استحصال کا شکار ہیں۔مرد ہر شئے کے حوالے سے سماج کی ناانصافی کا شکار نظر آتا ہے۔دونوں مجموعوں اور ایک ناولٹ میں اس طرح کے کرداروں کو پیش کیا گیا ہے جو روایت سے بغاوت کی کوشش کرتے ہیں۔لیکن ان کے تمام کردار روایتوں کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے بھی دکھائی دیتے ہیں۔

شعیب خالق تکنیکی، تخلیقی، اور اسلوب کے اعتبار سے جدید تقاضوں کو دور حاضر کے مطابق پورا کر رہے ہیں۔شعیب خالق دور حاضر کے ایک فکشن نگار ہیں۔اپنے ناولٹ میں شعیب خالق نے جدید دور کے انسان کی اصلیت سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی ہے کہ انسان اپنا آپ ہمیشہ دوسروں سے چھپاتا ہے۔کبھی بھی اپنا اصلی چہرہ دوسروں کے سامنے ظاہر نہیں ہونے دیتا۔اپنے ناولٹ کے ذریعے جدید دور کے انسان کی فطرت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جدید دور کے اندر انسان اپنی تکمیل کی خواہش میں اپنی مرضی کی حیات ڈھونڈتے پھرتے ہیں اور عائلی زندگی کی منافقانہ روش کے ہاتھوں پسنے والے افراد کی عکاسی کی ہے۔فکشن کی تمام کہانیاں اپنے اردگرد ماحول کی عام چلتی پھرتی کہانیاں ہیں۔شعیب خالق نے ایک سچے فنکار کی حیثیت سے بیانیہ انداز میں جدید معاشرے کے مسائل کو عمدہ انداز میں اجاگر کیا ہے۔

شعیب خالق بنیادی طور پر ایک افسانہ نگار ہیں۔ان کے افسانے تجریدی نقطہ نظر اور علامت کے حامل ہیں۔جبکہ ان کے ناولٹ "آنٹی" کی کہانی جو روایتی فضا اور اور اظہار کی آئینہ دار ہے۔اس حوالے سے دیکھا جائے تو وہ ایک ناول نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے افسانہ نگار بھی ہیں۔اردو ادب کے معیار پر ان

کاناولٹ "آنٹی" پورا اترتا ہے۔ناولٹ کا انتساب شعیب خالق نے عصمت چغتائی کے نام کیا ہے۔افسانہ نگاری کے ساتھ ساتھ ناول نگاری میں بھی شعیب خالق کمال رکھتے ہیں۔ناولٹ "آنٹی"اور افسانوی مجموعہ "چھتری نما کہانیاں "انسانی صورتحال اور سماج کو نمایاں کرتا ہے۔ان دونوں مجموعوں کے ذریعے انسانی نفسیات کو ظاہر کیا گیا ہے۔ان کا فسانوی مجموعہ "بے حرف لفظ "کے ذریعے انسان کائنات اور خدا کے حوالے سے مختلف سوالات کا پرچار کیا گیا ہے۔کائنات اور کائنات کی حقیقت کے حوالے سے مختلف سوالات کو اپنی کہانیوں میں پیش کیا ہے۔ اس طرح ان کا ناولٹ"آنٹی" معاشرے کے ماحول کو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کرتا ہے۔شعیب خالق اپنے ناولٹ میں ماضی،حال اور مستقبل تینوں زمانوں کو ساتھ لے کر چلتے نظر آتے ہیں۔

شعیب خالق کی شخصیت ایک ادبی شخصیت کہلانے کی مستحق ہے۔نہ صرف ادب سے ان کا ایک خاص لگاؤ ہے بلکہ ایک ادبی شخصیت ہونے کے ساتھ ساتھ میڈیا سے بھی خاص وابستگی ہے۔پرائیوٹ چینل کے ساتھ آج بھی ایک تعلق قائم ہے۔ڈرامہ نگاری میں شعیب خالق کو کمال کی مہارت حاصل ہے۔انہیں پی ٹی وی ایوارڈ بھی دیا گیا ہے۔

فکشن کے حوالے سے شعیب خالق ادبی حلقوں کے اندر ایک خاص پہچان رکھتے ہیں۔کیونکہ ان کی کہانیوں کے واقعات اس انداز سے ترتیب دیے گئے ہیں کہ کہانیوں کے انجام تک پہنچ کر ایک سبق آمیز دائرے میں قاری خود کو محسوس کرتا ہے۔ قاری کا ذہن فکر اور سوچ کی فضا میں محو ہو جاتا ہے۔ناولٹ میں شعیب خالق نے فلیش بیک کی تکنیک کو استعمال کیا ہے۔واقعات میں ایک تسلسل اور ربط نظر آتا ہے، کہانیوں کے تمام واقعات لڑی کی صورت میں آپس میں ہوئے ملتے ہیں۔کہانیوں کے اندر بے ترتیبی اور جول کا احساس نہیں ہوتا۔

شعیب خالق نے اپنے فکشن کے اندر سماجی،نفسیاتی،بے چینی اور معاشرتی ماحول کا ذکر اپنی کہانیوں میں بھرپور انداز میں کیا ہے۔ہر منظر اور ہر واقعے کو اس کی جزئیات نگاری کے ساتھ بیان کیا ہے۔شعیب خالق نے فکشن میں جزئیات نگاری کا خاص خیال رکھا ہے اور مختلف واقعات کو جزئیات کے ساتھ بیان کیا ہے۔

نتائج:

زیر تحقیق مقالے میں شعیب خالق کے دو افسانوی مجموعے اور ناولٹ کو شامل کیا گیا ہے۔مردانہ اور نسوانی کرداروں کے حوالے سے جدید معاشرے کے داخلی اور خارجی مسائل کی تفصیلات جاننے کی کوشش کی

گئی ہے۔ ۱۹۹۰ء سے ۲۰۱۹ء تک ان کے مجموعے شائع ہوئے۔ دورانِ تحقیق اس مقالے میں ان کو شامل کیا گیا۔

۱۔ دورانِ تحقیق جو بات سامنے آئی یا جس بات کو شدت سے محسوس کیا گیا وہ یہ ہے کہ شعیب خالق جدید معاشرے کے فرد کے مسائل کو منفرد طریقے سے پیش کرتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود ان کا ہر کردار ایک نئے مسائل کے ساتھ اپنی شخصیت کو واضح کر رہا ہے۔

۲۔ شعیب خالق کے زیادہ تر افسانے جدید معاشرے کے فرد کے داخلی اور خارجی مسائل کے تناظر میں لکھے گئے ہیں۔ ان کا یہ کردار چاہے کسی بھی طبقے سے تعلق رکھنے والا ہو کہانی کے آخر میں کسی نہ کسی صورت میں جاگیر دار طبقے سے وابستہ دکھائی دیتا ہے۔ کیونکہ جاگیر داروں کا شکار ہمیشہ غریب ہی بنتا ہے۔ جاگیر دار اپنا مفاد اپنے سے اوپر کے لوگوں سے نہیں حاصل کر سکتا۔ اس کی مثال ان کا افسانہ "ایک نوکر کی کہانی" ہے کہ جس میں ایک باپ جاگیر درانہ نظام کی وجہ سے اپنے ہی کم سن بیٹے کو معمولی تنخواہ پر شہر کی ایک کوٹھی میں ملازمت دلوا دیتا ہے۔ جو دن رات کام کر کے باپ کا سہارا بننے کی کوشش کرتا ہے۔ گویا شعیب خالق کے ہاں اکثر کردار بے بسی اور سستی شہرت کے پیچھے بھاگنے والے دکھائی دیتے ہیں۔

۳۔ ان کے مردانہ کردار زیادہ جاندار ہیں بانسبت نسوانی کردار کے۔ ایک ہی کہانی میں سے اگر مردانہ اور نسوانی کرداروں کو ساتھ رکھ کر پرکھا جائے تو مردانہ کردار زیادہ متحرک دکھائی دیتے ہیں۔ مصنف کے متحد مردانہ کردار اپنی ذات میں مکمل ہیں۔ ان کے ہاں مرد کا کردار خاص انقلابی شعور کا حامل دکھائی دیتا ہے۔ یہ کردار طاقت کے علمبر داروں اور غربت کو معاشرے میں ایک ایسی سطح پر لا کھڑا کرتا ہے کہ قاری کے دل میں خواہش پیدا ہوتی ہے کہ کاش کچھ ایسا ہو جائے کہ غریب فرد اپنی عزت اور اولاد کو بے یار و مددگار نہ چھوڑے۔

۴۔ شعیب خالق کے ہاں غریب طبقے کے مسائل پیش کیے گئے ہیں۔ ان میں مرد معاشرے کے ساتھ بے بس اور لاچار دکھائی دیتا ہے۔ اپنے وجود کے حصّے کو بیچنے کے باوجود بھی ان کے کردار غربت کا خاتمہ نہیں کر سکتے۔ ان کی کہانیوں میں کسی قسم کا جھول نہیں ہوتا۔ بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے روح کی گہرائیوں سے ان کے کردار آپس میں بات چیت کر رہے ہوں۔ غرض یہ کہ ان کے کردار حقیقت نگاری کے قریب تر دکھائی دیتے ہیں۔

۵۔ دورانِ تحقیق جس بات کو شدت سے محسوس کیا گیا وہ یہ ہے کہ مصنف کا تعلق ایک ایسے علاقے

سے ہے جہاں سرمایہ دار طبقے اور جاگیر دار طبقے نے جال بچھا رکھا ہے۔ جہاں لوگ اپنا مفاد حاصل کرنے کے لیے لوگوں کا استعمال کرتے ہیں۔ شعیب خالق اتنی عمدگی سے جدید معاشرے کے اندر جاگیر درانہ سماج کی عکاسی کرتے ہیں کہ سرمایہ درانہ نظام کی بدولت متوسط طبقے کی ابتر حالت کو اپنے فکشن کے ذریعے بیان کیا ہے۔ اپنے دونوں افسانوی مجموعوں اور ناولٹ میں سرمایہ دارانہ نظام سے دوچار افراد کے داخلی اور خارجی مسائل کو بیان کیا ہے۔

۶۔ شعیب خالق کے ہاں طنز کی کاٹ بھی جابجا نظر آتی ہے۔ مختلف کہانیوں میں بناوٹی معاشرے کے رویوں پر گہرا طنز کیا ہے۔ کسی ایک خاص طبقے پر ان کا یہ طنز محدود نہیں رہتا بلکہ اس کی لپیٹ میں جدید معاشرے کے افراد، ممالک اور ادارے آتے ہیں۔ گھر کی چار دیواری سے شروع ہو کر معاشرے کے مختلف شعبوں پر منفرد انداز میں طنز کرتے ہیں۔ معاشرے کی ناانصافیوں اور لوگوں کی بے حسی کو اپنی کہانیوں میں اجاگر کرتے ہیں۔

تجاویز و سفارشات:

معاشرے کا سب سے اہم طبقہ ادیب کا ہوتا ہے۔ لوگوں کے درد کو محسوس کر کے کہانی کی صورت میں ڈھال کر پیش کرتا ہے۔ اپنے قلم کو کسی انعام واکرام کے لالچ کے بغیر متحرک رکھتا ہے۔

ا۔ شعیب خالق نے اپنی کہانیوں میں متحد ایسے کردار تخلیق کیے ہیں جو معاشرے میں داخلی اور خارجی مسائل کی وجہ سے ذلت کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ انھوں نے معاشرتی حقائق کو اپنی کہانیوں کے ذریعے بیان کیا ہے اور معاشرے میں فرد کے داخلی اور خارجی مسائل سے پردہ فاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ جن پر آج تک پردہ رہنے سے سرمایہ دارانہ طبقہ اپنا شملہ اونچا کیے ہوئے ہے۔

۲۔ شعیب خالق نے دیہاتی زندگی کے مسائل کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ پنجاب کی ثقافت کا ایک رنگ ان کے افسانوں میں بھی نظر آتا ہے۔ اس حوالے سے اگر ان کا تقابل عصمت چغتائی اور منٹو کے افسانوں کے ساتھ کیا جائے تو کافی عمدہ نتائج آسکتے ہیں۔

۳۔ اردو ادب میں بے باکانہ انداز عصمت چغتائی کے ہاں انتہا درجے کا دکھائی دیتا ہے۔ معاشرے میں پھیلنے والی گندگی اور غلاظت کا سبب بننے والے لوگوں کے بارے میں بنا کسی خوف اور ڈر کے بیان کرتے ہیں۔ شعیب خالق کے افسانوں اور ناولٹ میں عصمت چغتائی کا بے باکانہ انداز پایا جاتا ہے۔ کسی حد تک عصمت

چغتائی کے افسانوں کا شعیب خالق کے افسانوں کے ساتھ تقابل کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ عصمت چغتائی کے ناول "ٹیڑھی لکیر" میں "شمن" کا کردار بھی اس معاشرے کا پیدا کردہ ہے اور شعیب خالق کے ناولٹ "آنٹی" میں "عابدہ" کا کردار بھی اسی معاشرے سے وابستہ ہے۔ وہ ایک عزت دار عورت سے بد کردار عورت بن جاتی ہے۔

۴۔ شعیب خالق مظلوم اور بے بس معاشرے کی آواز ہیں۔ افلاس کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبے یہ لوگ رحم اور شفقت کے قابل ہیں۔ اور ایسے میں شعیب خالق کے فکشن میں نسائی مسائل کی عکاسی پر مقالہ لکھا جائے تو دور عمدہ نتائج بر آمد کیے جاسکتے ہیں۔

۵۔ شعیب خالق کے افسانوں میں زیادہ تر دیہاتی لوگوں کے مسائل نظر آتے ہیں۔ دیہات کے لوگوں کے مسائل کے حوالے سے ان کے افسانوں کا احمد ندیم قاسمی اور غلام عباس کے افسانوں سے تقابل کیا جاسکتا ہے۔

۶۔ شعیب خالق جدید دور کے لکھنے والے ہیں ان کے ہاں دیہات کی پیش کش اور ابتدائی دور کے افسانہ نگاروں کے ہاں دیہات کی پیش کش کا تقابل بھی کیا جاسکتا ہے۔

کتابیات

بنیادی مآخذ

شعیب خالق، بے حرف لفظ، رمیل ھاوس آف پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۱۹ء

شعیب خالق، آنٹی، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۰۱ء

شعیب خالق، چھتری نما کہانیاں، رمیل ھاؤس آف پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۱۹ء

ثانوی مآخذ:

آل احمد سرور، نظر اور نظریے، اردو اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۷ء

ابن کنول، ڈاکٹر، داستان سے ناول تک، اسٹار آفسیٹ، دہلی، ۲۰۰۱ء

ابن کنول، پروفیسر، اردو افسانہ، کتابی دنیا، دہلی، ۲۰۱۱ء

ابوالکلام قاسمی، مرتب آزادی کے بعد اردو فکشن مسائل ومباحث،، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، ۲۰۰۱ء

ابوالحسن علی ندور، سید، مذہب وتمدن، مکتبہ جامعہ، دہلی، ۱۹۴۳ء

ابوالاعجاز صدیقی (مرتب)، کشاف تنقیدی اصطلاحات، طبع دوم، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۸

احسان اللہ خان، ڈاکٹر، مذہب اور سائنس، بیت الحکمت سیکٹر، دہلی، ۱۹۸۱ء

ارشد محمود، ثقافتی گھٹن اور پاکستانی معاشرہ، سٹی پریس بک شاپ، کراچی، اشاعت دوم، ۲۰۱۹ء

اظہار اثر، آج کی سائنس، اردو اکادمی، دہلی، ۲۰۰۶ء

اقبال آفاقی، ڈاکٹر، مابعد جدیدیت فلسفہ و تاریخ کے تناظر میں، مثال پبلیشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۳ء

الطاف انجم، ڈاکٹر، اردو میں مابعد جدید تنقید (اطلاقی مثالیں ومسائل وممکنات)، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی، اشاعت اول، ۲۰۱۳ء

اندر جیت لال، سائنس کی باتیں، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۲ء

تبسم کشمیری، ڈاکٹر، نئے شعری تجزیے، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۷۸ء

تجمل حسین عباسی، ہمارا معاشرہ، ابلاغ پبلیشرز اردو بازار، لاہور، ۲۰۰۱ء

جاوید، قاضی، وجودیت، فکشن ھاؤس، لاہور، ۱۹۹۸ء

خالد سہیل، مذہب، سائنس، نفسیات، موڈرن پبلشنگ ہاوس، دہلی، ۱۹۹۸ء

خالد علوی، ڈاکٹر، اسلام کا معاشرتی نظام (اسلام اور جدید معاشرتی نظریات)، الفیصل ناشران، لاہور، ۲۰۰۵ء

خلیل شرف الدین، مذہب کی حقیقت، لاہوتی فائن آرٹ، دہلی، ۱۹۸۰ء

دیش بھگت لالہ ہردیال، مذہب اور انسانیت، میسرز لاچپت رائے اینڈ سنز پبلیشرز، لاہور، ۱۹۳۸ء

رشید امجد، ڈاکٹر، پاکستانی ادب رویے اور رجحانات، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء

رشید امجد، ڈاکٹر، جدید ادبی تناظر، الفتح پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۱۲ء

زینت افشاں، ڈاکٹر، اردو فکشن پر سقوط ڈھاکہ کے اثرات، ادارہ یادگار غالب، کراچی، ۲۰۱۶ء

سجاد ظہیر ادبی خدمات اور ترقی پسند تحریک از گوپی چند نارنگ، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، ۲۰۰۷ء

سلیم آغا قزلباش، ڈاکٹر، جدید اردو افسانے کے رجحانات، انجمن ترقی اردو، پاکستان، ۲۰۰۰ء

سلیم اختر، ڈاکٹر، مغرب میں نفسیاتی تنقید، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء

سلیم اختر، ڈاکٹر، ادب اور کلچر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء

سہیل انجم، مترجم، تہذیبوں کا تصادم اور عالمی نظام کی تشکیل نو، آوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، س ن

شعیب عتیق، ڈاکٹر، اردو کے افسانوی ادب پر فسادات ۱۹۴۷ء کے اثرات، بیکن بکس، لاہور، ۲۰۱۴ء

شفیق انجم، ڈاکٹر، اردو افسانہ، بیسویں صدی کی ادبی تحریکوں اور رجحانات کے تناظر میں، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء

شکیل الرحمٰن، فکشن کے فنکار پریم چند، عرفی پبلی کیشنز، ہریانہ، ۲۰۰۰ء

شمشاد حسین، پروفیسر، انسانی کردار ایک نفسیاتی و معاشرتی تجزیہ، ترجمہ، ذکیہ مشہدی، خدابخش اورنیٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۲۰۰۰ء

شمیم حنفی، جدیدیت اور نئی شاعری، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء۳

شمیمہ بیگم، ڈاکٹر، ترقی پسند تنقید کا ارتقاء اور احتشام حسین، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۸۷ء

صاحب علی ڈاکٹر، اردو فکشن کا مطالعہ، فکشن ھاوس، لاہور، ۲۰۱۸ء،

صدیق سالک، میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا، الفیصل ناشران، لاہور، ۲۰۱۰ء

صفیہ عباد، رشید امجد کے افسانوں کا فنی و فکری مطالعہ، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء

عبد السلام، پروفیسر، ڈاکٹر، عبد الحق حسرت، عصمت چغتائی اور نفسیاتی مسائل، اعجاز پبلشنگ ہاوس، دہلی، ۱۹۸۹ء

عبد المجید سالک، تشکیل انسانیت، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۹۴ء

عصمت جمیل، ڈاکٹر، نسائی شعور کی تاریخ اردو افسانہ اور عورت، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، ۲۰۱۲ء

عمر فاروق، ڈاکٹر، اصطلاحات نقد و ادب، اردو اکادمی، دہلی، اشاعت اول، ۲۰۰۴ء

غلام کبریا، پیدوار، سماج اور صنعتکاری، فکشن ھاوس، لاہور،۲۰۰۱ء

فاطمہ حسن، فیمنزم اور ہم ادب کی گواہی، وعدہ کتاب گھر، کراچی،۲۰۰۵ء

فتح محمد ملک، تحسین وتردید، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور،۱۹۹۵ء

فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو فکشن کی تاریخ، بیکن بکس، ملتان،۲۰۰۶ء

فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو فسانہ اور افسانہ نگار سوانحی خاکے، تاریخی پس منظر اور تخلیق اول کی روشنی میں، مکتبہ، جامعہ، نئ دہلی،۲۰۰۱ء

فہمیدہ ریاض، ادب کی نسائی رد تشکیل، وعدہ کتاب گھر، کراچی،۲۰۰۶ء

قمر جلیل، جدید اردو ادب کی سرحدیں، جلد دوم، مکتبہ دریافت کراچی،۲۰۰۰ء

قمر رئیس، ڈاکٹر، اردو ڈرامہ انتخاب مع مقدمہ، سرسید بکڈپو، علی گڑھ،۱۹۶۱ء

گوپی چند نارنگ، جدیدیت کے بعد، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور،۲۰۰۶ء

لیاقت حسین ہاشمی، ہم پیچھے کیوں ہیں؟، نگارشات پبلیشرز، لاہور،۲۰۱۱ء

محمد اسلم فاروقی، ڈاکٹر، سائنس نامہ اردو میں سائنسی مضامین کا مجموعہ، امان پبلیشرز، حیدر آباد،۲۰۱۴ء

محمد اشرف کمال، ڈاکٹر، تنقیدی تھیوری اور اصطلاحات، مثال پبلیشرز، فیصل آباد،،۲۰۱۶ء،

محمد احسن فاروقی / نور الحسن ہاشمی، ڈاکٹر، ناول کیا ہے؟، دانش محل، لکھنو، س ن

محمد حامد چھپروی، افسانہ کا ارتقاء، نظامی پریس لکھنو،۱۹۸۶ء

محمد قاسم، ڈاکٹر، اردو ڈرامہ نگاری کے ارتقاء میں بہار کا حصہ، بہار اردو اکیڈمی، پٹنہ،۱۹۹۷ء

مرتضی علی اطہر، ڈاکٹر، فہمیدہ ریاض کی شاعری میں جدید عورت، کتابی دنیا، دہلی،۲۰۰۹ء

ممتاز مفتی (افسانہ ڈائری) فیروز سنز، لاہور،۱۹۹۸ء

ناصر عباس نئیر، جدید اور مابعد جدید تنقید، (مغربی اور اردو تناظر میں)، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی،۲۰۰۴ء

ندیم احمد، ڈاکٹر (مرتب)، ترقی پسندی، جدیدیت مابعد جدیدیت، شاہین باغ ابوالفضل، نئ دہلی،۲۰۰۲ء

نریش ندیم، جدیدیت ایک ہمہ پہلو محاسبہ، ایچ۔ ایس۔ آفسیٹ پرنٹرز، نئ دہلی،۲۰۰۱ء

نرم چندر، مذہب اور سائنس (دیرم اور گیان)، ستیہ گیاں، پبلشنگ سوسائٹی اوکاڑہ، س ن،

وحید الدین خان، مولانا، مذہب اور سائنس، نظام الدین ویسٹ مارکیٹ، نئ دہلی،۱۹۸۰ء

وزیر آغا، ڈاکٹر، جدیدیت ایک تحریک، مشمولہ، جدیدیت کا تنقیدی تناظر، س ن،

وقار عظیم، افسانہ نگاری، سرسوسی پبلشنگ ہاوس، الہ آباد، س ن

وقار عظیم، داستان سے افسانے تک، جمال پرنٹنگ پریس، دہلی، ۱۹۷۲ء
وقار عظیم، نیا افسانہ، ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ، ۱۹۸۲ء
یاسمین فاطمہ، جدید اردو افسانے میں عصری حیثیت، مکتبہ شعر وحکمت، ۱۹۸۷ء

انٹرویو:

رشید امجد، ڈاکٹر (انٹرویو)، از محمد شعیب خان، اسلام آباد، ۷ جولائی، ۲۰۱۹ء، بوقت، ۱:۳۰
شعیب خالق (انٹرویو)، از محمد شعیب خان، بمقام کشمیر روڈ، صدر، راولپنڈی، بتاریخ ۲۶ جون ۲۰۱۹ء، بوقت ۵ بجے
نجیبہ عارف، ڈاکٹر (انٹرویو)، از محمد شعیب خان، بمقام البیرونی بلاک، بین الاقومی اسلامک یونیورسٹی
اسلام آباد، بتاریخ ۲۶ فروری ۲۰۲۰ء، بوقت ۲ بجے دوپہر

مقالہ جات:

احمد رضا، ڈاکٹر، اسلام کا معاشرتی اور سیاسی نظام، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد، ۲۰۱۸ء
ایم سلطانہ بخش، ڈاکٹر، پاکستانی ادبیات میں خواتین کا کردار، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد، ۱۹۹۶ء
صوبیہ سلیم، اردو ناول کے کلیدی نسوانی کردار، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء
نازیہ ملک، پاکستانی اردو افسانے میں عصری آگاہی: تجزیاتی مطالعہ، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، ۲۰۱۴ء
وحید عشرت، ڈاکٹر، فلسفہ عمرانیات، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء

غیر مطبوعہ مقالات:

نوشیلہ انجم، شعیب خالق کے افسانے بے حرف لفظ اور ناولٹ آنٹی کا فنی اور فکری جائزہ، شعبہ اردو، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء

رسائل وجرائد:

احمد سہیل، جدید مابعد جدیدیت تقابل و تجزیہ، مشمولہ سمبل، راولپنڈی، ۲۰۰۶ء
احمد سہیل، ڈاکٹر، جدیدیت مابعد جدیدیت تقابل و تجزیہ، مشمولہ، سمبل، راولپنڈی، ۲۰۰۲ء
اہم خالد فیاض، جدیدیت کی تحریک، مشمولہ، سمبل خاص شمارہ ۵
بینش فاطمہ، جدیدیت مابعد جدیدیت اردو نثر کے تناظر میں، مشمولہ، دریافت، شمارہ ۱۸، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

ممتاز احمد، ڈاکٹر، وجودیت منظر و پس منظر، مطبوعہ، فنون، لاہور، جولائی، اگست، ۱۹۶۶ء
نازیہ یونس، ڈاکٹر، قتیل شفائی کی نظموں میں عورت کا المیہ، مشمولہ، دریافت، شمارہ ۱۸، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد
ناصر عباس نیئر، اردو تنقید میں جدیدیت کے مباحث، مطبوعہ، دریافت شمارہ ۳ ستمبر ۲۰۰۴ء، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، ص ۲۸۴
وزیر آغا، ڈاکٹر، سوال یہ ہے، اوراق، لاہور، ستمبر ۱۹۷۳ء

لغات:

جمیل جالبی، قومی انگریزی اردو لغت مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۸ء
شان الحق حقی، آکسفورڈ انگلش اردو ڈکشنری، آکسفورڈ پریس، کراچی، ۲۰۰۹ء
مولوی عبدالحق، ڈاکٹر، دی اسٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۸۵ء